باب اول

محمد علی : پس منظر و پیش منظر

1857ء تا 1906ء

پس منظر

محمد علی بن عبد العلی (1848ء -1880ء) بن علی بخش (1813ء -1867ء) بن محبوب بخش (1770ء -1828ء) بن امان اللہ (1785- 86ف) بن طفیل محمد بن فیض محمد بن مدار بخش بن محمد اعظم اللہ بن حیات اللہ) جنھوں نے تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کے نام سے شہرتِ عام وبقائے دوام حاصل کی۔ 10 دسمبر 1878ء مطابق 15 ذوالحجہ 1295ھ بروز منگل ہندوستان کی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست رامپور (یوپی) میں پیدا ہوئے[1] یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی قیادت وسیادت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ قبل ازیں مسلمانوں نے یہاں چھ سو سال تک حکومت کی تھی۔ لیکن اٹھارویں صدی سے وہ مسلسل مائل بہ تنزل رہے۔ یہاں تک کہ 1857ء میں انکی حکومت کا باقاعدہ خاتمہ ہو گیا۔ اور انکی جگہ اب عیسائی حکومت نے لے لی۔ اس حکومت کا تعلق ملک انگلستان سے تھا۔ ابتدا میں یہ لوگ تاجروں کی حیثیت سے ہندوستان آئے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے سیاسی عدم استحکام، درباری سازشوں، گروہی تعصبات اور کمزور قیادت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کامیاب حکمت عملی کی بدولت وسط انیسویں صدی میں کل ہندوستان کے مالک بن گئے۔ ہمارے خطے کا سیاہ نصیب نوآبادیاتی دور اس سلسلے کی کڑی تھا۔[2]

غیر ملکی عیسائی حکومت جو کہ تاریخ میں عام طور سے انگریز حکومت کے نام سے مشہور ہوئی اسکے دور اقتدار میں مسلمانان ہند کو بالخصوص سنگین مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی طور پر انکا اثر ورسوخ ختم ہو گیا تو معاشی پریشانیاں انکی زندگی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔ وہ خاندان جو سیاسی افق پر آفتاب وماہتاب کی مانند جگمگا رہے تھے اپنا اقتدار چھن جانے کے بعد اب معاشی مسائل سے دوچار ہوئے۔ تو لامحالہ اسکا اثر انکی سماجی زندگی پر بھی پڑا۔ سماجی ومعاشی پریشانیوں کی ایک وجہ نئی حکومت کی زرعی لگان اور سرکاری ملازمتوں کے بارے میں نئی حکمت عملی تھی۔ جسکا براہ راست اثر مسلم معاشرے کے اعلی طبقے یعنی "اشراف" پر پڑا۔ کیونکہ نئے قوانین اور حکمت عملی "طبقہ اشراف" کے خیالات ورجحانات اور اعتقادات ونظریات سے متصادم تھے۔ جنھیں ایک عرصہ تک انہوں نے قبول نہ کیا۔ اسکی وجہ سے وہ دن بدن معاشی بدحالی اور سماجی ابتری کا شکار ہوتے گئے۔ انگریز بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ ایک سرکاری رائے کے مطابق :۔

> "بنگال میں مغل حکومت کے جانے اور انگریزوں کے ہاتھ حکومت آنے کے وقت مسلمانان بنگال خاصے خوشحال اور دولت مند تھے۔ سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں کا ایک بڑا حصہ انکے پاس تھا۔ لیکن انگریزی اثر ورسوخ قائم ہونے کے بعد انکی حیثیت پر برا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ جائیداد کی ترقی اور فارسی کی بجائے

انگریزی کا بطور دفتری زبان کے اجراء یہ سب مسلم زوال کے اسباب ہیں۔"[3]

یہ تو صرف بنگال جیسے زرخیز صوبے کے بارے میں ایک مختصر سا سرکاری حوالہ تھا۔ ہندوستان کے دیگر صوبوں مثلاً پنجاب، سندھ، مدراس، بمبئی، یوپی اور سی پی وغیرہ میں بھی مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی حالت کسی طور بہتر نہ تھی۔ مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں نے نئے حکمرانوں کی حکمت عملی، تعلیمی پالیسیوں اور نئے نئے قوانین کو فوراً قبول کر لیا۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ نتیجتاً انکے لئے نئی حکومت کی طرف سے پیش کردہ ان تمام مراعات کا حصول آسان ہو گیا جو مقامی لوگوں کیلئے مختص تھیں۔ لہذا ہندو ترقی کی دوڑ اور معاشی و سماجی خوشحالی کے لحاظ سے مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے۔ جہاں نئے نظام اور نئی تبدیلیوں کو فوری طور پر قبول کرنے سے ہندوؤں کو معاشی لحاظ سے خوشحال، سماجی لحاظ سے مستحکم ہونے اور نئے حکمرانوں کے قریب آنے کا موقع ملا۔ وہاں مسلمانوں سے انتقام لینے کا نادر موقع بھی انکے ہاتھ آگیا۔ ایک انگریز نے خود اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ :۔

"سرکاری ملازمت کے ہر شعبے اور ہر سرکاری دفتر میں مسلمانوں کی راہ میں ناجائز روڑے اٹکائے جاتے ہیں کیونکہ اکثر اعلیٰ ملازم ہندو ہیں۔"[4]

ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر نے مسلمانوں کی قابل رحم حالت کی اسطرح تصویر کھینچی ہے کہ :۔

"مسلمان اس حد تک بے یار و مددگار ہو چکے تھے کہ کوئی شخص بھی انکی طرف دھیان نہیں دیتا تھا اور اعلیٰ حکام تو انکے وجود تک کا اعتراف کرنا بھی کسر شان سمجھتے تھے۔ نہ صرف حکومت مسلمانوں کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ کھلے بندوں انکی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ اس ناانصافی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب سندربن کے کمشنر کے دفتر کیلئے چند آسامیوں کا اشتہار دیا گیا تو اس میں یہ ضمنی اعلان بھی شامل تھا کہ صرف ہندوؤں کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔"[5]

یہ فطری بات تھی کہ نئے حکمرانوں نے اپنے پیشروں پر شک و شبہ کیا اور انکے مقابلے میں ہندوؤں کو نوازا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ :۔

"انکے اقتدار کی توسیع اور بقا میں جو واحد رکاوٹ باقی رہ گئی تھی وہ مسلمان تھے۔ اسلئے انھیں کچل کر رکھ دینا چاہیے۔"[6]

لہذا جب مسلمانوں میں سے کچھ نے اپنے آپکو نئے حالات اور ضروریات کے مطابق اہل بنایا اور حکومت کی پیش کردہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی تو انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ انگریز کا دل انکی طرف سے صاف نہ تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ہر جگہ ہندو چھائے ہوئے تھے۔ جن سے مسلمان کسی خیر یا بھلائی کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمان معاشی طور پر مفلوک الحال اور سماجی طور پر ابتری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اس افسوسناک صورتحال کے بارے میں صوبوں کے اخبارات نے کھل کر تنقید اور اظہار خیال کیا۔ صوبہ سندھ کے ایک اخبار "الحق" نے مسلمانوں کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"سرکاری دفتروں میں ہندو افسروں نے سندھ کے مسلمانوں کو جائز حقوق سے

محروم کر رکھا ہے۔ چونکہ سندھ کے تمام اضلاع میں دفتر دار اور ہیڈ منشی (کلرک) ہندو ہیں۔ اسلئے انہی کا اثر و رسوخ چلتا ہے اور مسلمان ملازمت کے سلسلے میں دفتروں کے اعلیٰ آفسر تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔"[7]

ایک دوسرے صوبے مدراس کے مسلمانوں کی سماجی و معاشی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہاں کے ایک اخبار نے اسطرح لکھا کہ :۔

"جب بھی کسی سرکاری دفتر میں کوئی عہدہ خالی ہوتا ہے تو کوئی ایسٹ انڈین یا ہندو اسکے لئے نامزد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر دفتر میں منیجر یا معاون اسسٹنٹ انڈین یا ہندو ہے نتیجتاً وہ کسی اپنے رشتہ دار یا پٹھو کا تقرر کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کو جا کھجا بھی نہیں دیتے۔"[8]

اگر کسی جگہ مسلمان بہتر حالت میں تھے بھی تو ہندوؤں نے انکے خلاف ایسی تحریکوں اور تنظیموں کو جنم دیا جنکا مقصد مسلمانوں کی سماجی و معاشی حالت پر کاری ضرب لگانا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یوپی میں جہاں دوسرے صوبوں کی طرح انگریزی زبان کا اجراء ہو چکا تھا۔ لیکن اردو زبان کو وہاں اب بھی دفتری حیثیت حاصل تھی۔ ہندوؤں نے یہاں بھی واویلا شروع کر دیا کہ اردو زبان کو یہاں سے بھی ختم کر دیا جائے۔[9] ہندی تحریک کے رہنما بابو شیو پرشاد (1823ء-1895ء) نے 1869ء کو بنارس انسٹیٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"مسلم اقتدار و حکومت اب باقی نہیں ہے۔ دلی اور لکھنؤ سے انکے بادشاہ اپنی بادشاہت کے ساتھ دریا برد ہو گئے ہیں۔ ملکہ (وکٹوریہ) کے زیر تسلط آنے کے بعد سے اس ملک میں انکے نقشہ حکومت پر سرخ نشان پھر گیا ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ملک کی عدالتوں میں اب بھی اردو کو برقرار رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"[10]

اس افسوسناک صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری رقمطراز ہیں کہ :۔

"گویا ہندو قومیت کے جوش میں تمدنی زندگی کے اس بنیادی رشتے ہی کو کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی جس میں ہندو اور مسلمان ہزار اختلاف کے باوجود کئی صدیوں سے بندھے ہوئے تھے۔"[11]

اس تناظر میں انگریزی زبان و تعلیم کی لیاقت بھی مسلمانوں کیلئے سودمند نہ ہو سکی۔ دوسرا مسلمان بھی اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انکا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کی ترویج مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور انکے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔[12] انکا یہ خیال کچھ غلط بھی نہ تھا۔ جسکا اندازہ لارڈ میکالے کی 1835ء کی اس تعلیمی یادداشت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں انگریزی تعلیم کی غرض و غایت ان الفاظ میں واضح کی گئی تھی کہ :۔

"ہمارا مقصد بہر طور ایک ایسا اقلیتی طبقہ پیدا کرنا ہے جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان، جس پر ہم حکمران ہیں، ترجمان بن جائے۔ ایسے لوگوں کا

طبقہ جو نسل و رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات، خیالات، اخلاق اور فکر کے لحاظ سے انگریز ہو۔"[13]

ابتدائی حالات

یہ تھا برصغیر کا سیاسی، سماجی اور معاشی پسِ منظر جب محمد علی نے جنم لیا۔ محمد علی بھی شاید ان حالات کا شکار ہو کر کچھ نہ کر پاتے لیکن انکی والدہ کی ہمت و جرأت نے انکی جدید تعلیم کیلئے راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی والدہ محترمہ آبادی بانو بیگم جو تاریخ میں "بی اماں" (1852ء - 1924ء) کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں، ایک عالی حوصلہ، راسخ الارادہ، روشن خیال، نیک طنیت اور دین دار خاتون تھیں۔ اگرچہ خود انہوں نے کسی مکتب و مدرسے سے تعلیم حاصل نہ کی تھی لیکن وہ جدید تعلیم کے حصول کی حامی تھیں۔ کیونکہ یہ چیز عین تقاضائے وقت تھی۔ وہ غلامی سے متنفر اور آزادی کی خواہاں تھیں۔ آبادی بانو بیگم دختر نواب درویش علی خان پنج ہزاری دربار اکبری، کا تعلق ایسے خاندان سے تھا۔ جس نے 1857ء کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف بڑی جرأت مندی اور بے جگری سے حصہ لیا تھا۔[14] محمد علی کے ننھالی بزرگوں میں سے مولوی بشارت علی خان، ولایت علی خان اور مہربان علی خان سر فہرست تھے جو اس جرم کی پاداش میں تختۂ مشق بنائے گئے۔ سامراجی ظلم و بربریت اور انکے بہیمانہ سلوک کا شکار ہوئے۔ جائیدادیں ضبط کر کے انکو مفلوک الحالی پر مجبور کر دیا گیا۔ جب ظلم کی انتہا ہو گئی تو مجبوراً محمد علی کے ننھالی بزرگوں کو روپوش ہونا پڑا۔ ان حالات نے محمد علی کی والدہ کے دل میں انگریز کی نفرت کو جاگزیں کر دیا اور آئندہ وقتوں میں آزادی عمل کیلئے سرگرم عمل کر دیا۔ دوسری طرف محمد علی کا ددھیالی خاندان انگریزوں کا وفادار اور مراعات یافتہ تھا۔[15] لیکن محمد علی کی شخصیت بی اماں کے زیرِ اثر پروان چڑھی تھی۔ یہ انہی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا جس نے محمد علی کے خیالات و نظریات اور کاموں کا دھارا ددھیالی خاندان کی روایات کے برعکس انگریزی حکومت و طاغوتی قوتوں کے خلاف موڑ دیا۔

اگرچہ والدہ محمد علی انگریزوں سے نفرت کرتی تھیں۔ لیکن وہ جدید تعلیم کے خلاف نہیں تھیں۔ وہ ایک باشعور اور دور بیں خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمہ جہت مخالفتوں کے باوصف اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اپنے اس ارادہ کے ساتھ اس مسلمان مشرقی خاتون کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جو حوصلہ شکن ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے اسکے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ عین عالم جوانی میں انکے شوہر عبدالعلی (1848ء - 1880ء) انہیں داغِ مفارقت دے گئے۔ اس وجہ سے چھ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہم ذمہ داریاں ان کے ناتواں کندھوں پر یکایک آن پڑیں۔ لیکن حالات کی اعصاب شکن سختیاں بی اماں کے حوصلے کا امتحان نہ بن سکیں۔ ان کا عزم صمیم مصائب کے سامنے ڈھال بن گیا۔ بقول محمد علی

> " میری ماں 27 سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ بعض ہمدردوں نے اصرار کیا کہ دوسری شادی کر لیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے شوہر نے میری کافی دیکھ بھال کی ہے اور اب میں اپنے پانچ شوہروں (لڑکوں) اور ایک بیوی (لڑکی)

کی دیکھ بھال کرونگی۔"[16]

محمد علی کے ولد عبدالعلی نے کوئی بڑا اثاثہ گھر کی گزراوقات کیلئے نہیں چھوڑا تھا۔ بلکہ وفات کے وقت وہ 30,000 (تیس ہزار روپے) کے مقروض تھے۔ گذارے کیلئے ایک معمولی سی جاگیر میں حصہ تھا جو ضلع مراد آباد میں واقع موضع "خانی سمار" تھی۔ جسکی سالانہ آمدنی تقریباً تین ہزار تھی، جو محمد علی کے چچا منشی اصغر علی خاں کے زیر نگرانی تھی۔[17] یہ آمدنی گھریلو ضروریات کی بمشکل کفالت کرتی تھی۔ لیکن آمدنی کا یہ ذریعہ بھی اس وقت ختم ہو گیا جب بی اماں نے اپنے بچوں کو سرکاری سکول میں داخل کرانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تاکہ وہاں وہ جدید تعلیم سے روشناس ہو سکیں۔ جوں ہی چچا کو بی اماں کے ارادوں کا علم ہوا تو یہ معمولی رقم دینے سے بنا بریں انکار کر دیا کہ انگریزی تعلیم سے بچے کافر ہو جائیں گے۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ چچا بچوں کی تعلیم اور ترقی کے خلاف تھے۔ وہ صرف انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ انکا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کا مقصد کفر والحاد ہے اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے انکے بھتیجے گمراہ ہو جائیں گے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تہہ میں انکا جذبہ خلوص پوشیدہ تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ موجودہ دور میں انگریزی تعلیم کے بغیر ترقی کے تمام راستے مسدود ہیں۔ انکے برعکس بی اماں جدید تعلیم کی اہمیت وافادیت سے واقف تھیں۔ اسلئے انہوں نے اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا عزمِ صمیم کر لیا۔ اور انکے عزم واستقلال کے سامنے کوئی دلیل یا مخالفت کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ اگرچہ ان حالات میں محمد علی کی والدہ کیلئے گھر کے اخراجات پورے کرنے کے علاوہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لیکن بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر انہوں نے ہر قسم کی جسمانی محنت ومشقت برداشت کی۔ حتیٰ کہ بچوں کے تعلیمی اخراجات کی تکمیل کے لیے ذاتی زیورات گروی رکھ دیے۔ آخر چچا بی اماں کی ثابت قدمی کے سامنے جھک گئے۔ زیورات واپس کرا دیئے اور تعلیم کے اخراجات کی ادائیگی بھی جائیداد سے شروع کر دی۔[18] بی اماں ایک انتھک خاتون تھیں جو رکاوٹوں کو پھلانگنے والی شیرنی کی طرح اپنے بچوں کے دل ودماغ کو غلامانہ ذہنیت اور پست خیالات سے بچاتی آزادی اور عالی حوصلگی کے مراحل طے کرنے کے اسباب فراہم کرتی رہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اسی عالی حوصلہ خاتون کی ابتدائی تربیت کا ثمر تھا جس نے محمد علی کو محمد علی جوہر بنا دیا۔

محمد علی کو انکی والدہ نے جسطرح خانگی ومعاشی مسائل کی فراوانی کے باوجود جدید تعلیم دلوائی۔ اس نے ابتدائی عمر میں ہی محمد علی کو جدید تعلیم کا حامی بنا دیا۔ جس کا اندازہ اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں نے رامپور اسکول میں دورانِ تعلیم "جدید تعلیم کی ضرورت" پر لکھا۔ اور رامپور اسٹیٹ گزٹ میں انسپکٹر آف اسکول کی رپورٹ کے ساتھ شائع ہوا۔[19] محمد علی قدیم وجدید تعلیم کا موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ قدیم تعلیم جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر اور بہت سی خامیوں سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں قدیم تعلیم کی خامیاں بیان کرتے ہو تحریر کیا کہ :-

> "ہماری ابتدائی تعلیم محض ناقص، ادھوری بلکہ خطرناک ہے۔ ایک مدت بغیر معنی الفاظ کے تعلیم پا کر فقط قوت کو کام میں لاتے ہیں۔ فکر وغور کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ غور وخوض کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ فکر وتامل کے معرکے میں ہماری عقل غیر مفید اور فکر نارسا ثابت ہوتی ہے۔"[20]

محمد علی نے جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تحریر کیا کہ :-

"جدید تعلیم کی جو ایشیائی رنگ سے بالکل سادہ اور جس کے اصول نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں، ہمارے واسطے نہایت ضرورت ہے۔ جیسے نابینا کو بینائی کی۔ باوجود کسی قدر تعلیم قدیم پانے کے ہنوز نامبارک لقب "نیم وحشی" انسان کا ہم سے واپس نہیں ہوا ہے۔"[21]

محمد علی کا یہ مضمون انکی ذہنی و مادی زندگی کے دو رخ پیش کرتا ہے۔ ایک تو انگریزی تعلیم کیلئے انکی فراخ دلی و ذہنی وسعت اور دوسرا گھریلو دینی تعلیم کے بعد ایک باقاعدہ اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے انکی تعلیمی سرگرمیوں کا حال۔ جن میں وہ بریلی ہائی اسکول میں داخلے سے پہلے درمیانی وقفے میں مصروف رہے۔ محمد علی نے اپنی اس تحریر میں جدید تعلیم کی جسطرح وکالت کی ہے۔ اس سے اُنکے ذہن رسا کی داد دینا پڑتی ہے۔ انہوں نے اسکی اہمیت کو اتنی کم عمری میں سمجھ لیا کہ اسکو کوئی معمولی واقعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جس وقت انہوں نے ان خیالات کا اظہار کیا اس وقت تک غالباً انہیں علی گڑھ تحریک اور اسکے رہنما کے بارے میں زیادہ معلومات بھی نہ ہوں۔ اسکے باوجود انکے ان خیالات پر یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے یہ علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خان (1817ء - 1898ء) یا انکے رفقاء الطاف حسین حالی (1837ء - 1914ء) اور محسن الملک (1837ء - 1907ء) وغیرہ کے قلم کا شاہکار ہو۔ درحقیقت یہ محمد علی کے اپنے خیالات تھے۔ لیکن انکو سمجھنے کیلئے محمد علی کی عملی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ ضروری ہے کہ وہ بنیادی طور پر خالصتاً مشرقی عادات و خصائل کے آدمی تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو مغربی ماحول کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہوں اور احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنی مادری زبان بولنا گناہ سمجھتے ہوں۔ انکی مستقبل کی زندگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی خود سپردگی کی وہ روش اختیار نہ کی جس میں قومی مزاج کی نفی اور مذہبی احترام سے بیگانگی ثابت ہو وہ جذباتی ضرور تھے لیکن اس جذباتی پن میں بگاڑ کی جائے سلجھاؤ نمایاں تھا۔

محمد علی کو کچھ عرصہ بعد رامپور اسکول سے گورنمنٹ ہائی اسکول بریلی بھیج دیا گیا جو رامپور سے تقریباً چالیس میل دور تھا۔ بریلی بھیجنے کی یقیناً چند اہم وجوہات تھیں۔ اولاً محمد علی کے دو بڑے بھائی ذوالفقار علی اور شوکت علی (1872ء - 1938ء) پہلے ہی سے وہاں زیرِ تعلیم تھے، جن سے نگرانی و سرپرستی مقصود تھی۔ (ذوالفقار علی رامپور کے پہلے طالب علم تھے جنھیں تمام مخالفتوں کے باوجود والدہ نے جدید تعلیم کیلئے بریلی بھیجا تھا) ثانیاً جدید تعلیمی معیار کے اعتبار سے یہ اسکول نئے تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔ ثالثاً دیگر اعلیٰ خاندانوں کے بچے بسلسلہ تعلیم بورڈنگ میں رہائش پذیر تھے۔ جنکے ساتھ میل جول سے آدابِ معاشرت، تہذیب و ثقافت سے آگاہی اور روابط استوار کرنا اہم تھے۔

رامپور کے علمی و ادبی اور ثقافتی ماحول نے محمد علی کے ذہنی دریچے کھولنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں بریلی کے ماحول نے محمد علی کی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی۔ اسکول میں انکی قابلیت کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ بلا کے ذہین مگر کم محنتی تھے۔ لیکن غیر معمولی ذہانت نے انکی کم محنتی کو ہمیشہ سربلند رکھا۔ درسی کتب کے مطالعہ میں دلچسپی کم مگر مباحثوں میں گرما گرم حصہ لیتے تھے۔ اگرچہ مزاج میں تیزی تھی لیکن حاضر جوابی، راست گوئی ان کا خاص وصف تھا۔ اسکول میں مسلم

طلبہ کی تعداد کم ہونے کے باوجود محمد علی میں جرأت، بے باکی اور حق گوئی بدرجہ اتم موجود تھی۔ میر محفوظ علی بدایونی کا بیان ہے کہ :۔

" محمد علی بریلی میں بلا کے ذہین، مگر کم محنت تھے۔ استاد خوش تھے۔ مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی تھی۔" [22]

محمد علی فطری طور پر قائدانہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انہوں نے عملی زندگی میں جس کا بھرپور انداز میں مظاہرہ کیا۔ قیامِ بریلی کے دوران کم عمری میں ہی انہوں نے اپنے ہم عمر طلبہ کی ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی جسکے وہ خود سیکریٹری تھے۔[23]

اگرچہ محمد علی کا خاندان معاشی پریشانیوں سے دوچار رہا۔ لیکن ہوشمند ماں نے اپنے بچوں کو ان اثرات سے محفوظ رکھا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کروانے کے بعد والدہ نے محمد علی کو علی گڑھ کالج میں داخل کروادیا (1890ء - 1898ء)۔ ہندوستان کی یہ عظیم درسگاہ جسکے بانی سید احمد خان تھے، علمی وادبی لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ جو مسلمانانِ ہند کیلئے سرمایہ عزت ووقار تھی۔ جہاں مسلمان خاندان اپنے بچوں کو تحصیلِ علم کیلئے بھیجنا باعث افتخار سمجھتے تھے۔ لیکن دوسری طرف تنگ نظر اور قدامت پسند مسلمانوں کے نزدیک علی گڑھ کفر والحاد کا مرکز تھا۔ وہ اس سے گریزاں تھے۔ اور اسکی تخریب میں ہمہ وقت مصروف۔ یہاں رہ کر یقیناً محمد علی کی جدید تعلیم کے بارے میں قائم کردہ رائے جسکا اظہار انہوں نے اوائلِ عمر میں کیا تھا کوجلا ملی اور مزید پختگی پیدا ہوئی۔ اسی درسگاہ میں انہوں نے اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں سے شاندار کامیابی حاصل کی اور نام کمایا۔ غیر معمولی ذہانت نے انہیں ہردلعزیز بنادیا۔ کالج میں انکی عدیم النظیر ذکاوت اور نادر المثال ذہانت کی دھوم تھی۔ محمد علی میں انگریزی کی استعداد بھی قابلِ رشک تھی۔ اس بات کا اندازہ ان کی انگریزی زبان کی تحریروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ کالج میں شعبہ انگریزی کے ہیڈ مسٹر ماریسن نے محمد علی کی انگریزی دانی کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

" محمد علی تم ایک زمانہ میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہوگے۔ " [24]

اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ مسٹر ماریسن کی یہ پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔

علی گڑھ میں محمد علی کو سجاد حیدر یلدرم (1880ء - 1940ء) اور حسرت موہانی (1875ء - 1951ء) جیسے طلبہ کی رفاقت ملی۔ جنھوں نے ادب وسیاست میں جھنڈے گاڑے۔ محمد علی بھی کسی طرح ان سے پیچھے نہ رہے۔ علی گڑھ کے شائستہ ادبی ماحول میں انکی شاعرانہ صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ سجاد حیدر کی معیت میں شعروسخن کا ذوق پروان چڑھا، جسے حسرت موہانی کی صحبت نے چار چاند لگادیئے۔ کالج کے مباحثوں میں محمد علی خصوصی دلچسپی لیتے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ غلط بات پر خاموش رہنا اور ناجائز کو برداشت کرنا انکی لغت میں شامل نہ تھا۔ وہ مصلحت اندیشی کو ناپسند کرتے تھے۔ انگریز حکام کا تحکمانہ لہجہ انہیں سرکشی پر آمادہ کردیتا تھا۔ جسکا پرتو بعد میں انکی عملی وسیاسی زندگی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔ وہ حاکمیت کے جلال اور غیر معقول کو کبھی بھی برداشت نہ کرتے تھے۔ اسلئے انگریز اساتذہ محمد علی کی قابلیت اور صلاحیتوں کے معترف ہونے کے باوجود انکے اس بے باکانہ کرداری پہلو کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ انگریز حکام واساتذہ اقتدار واختیارات کے نشے میں تعمیری تنقید کو بھی برداشت کرنے کے متحمل نہ تھے۔ محمد علی غلط کو غلط اور صحیح کو

صحیح کہنے کی جرأتِ رندانہ رکھتے تھے۔ خواہ اس سلسلے میں انہیں کیسی ہی مخالفت اور دشمنی کیوں نہ مول لینا پڑے۔ انکا یہی طرزِ عمل بعد کی تحریک آزادی میں بھی بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔ سجاد حیدر یلدرم محمد علی کی انہی کرداری خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :-

"ہم دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے یہاں پہنچ کر انکے (محمد علی) کردار کی خصوصیت نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو اپنے اقران و ہمعصروں میں سب سے علیحدہ کر دیا۔ (یعنی) محمد علی کی آزادی رائے اور آزادی عمل۔ وہ (صحیح بات پر) اپنے پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے۔ یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے۔ جس جانب تقریر کرنا اکثر پروفیسروں کی چیں بہ جبیں کا باعث ہوتا تھا۔ تقریر انکی (محمد علی) زوردار، زبان شستہ اور اپنے سن و سال کے لحاظ سے نہایت موثر ہوتی تھی۔"[25]

قیام علی گڑھ کے دوران جن شخصیات نے محمد علی کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان میں انکے بڑے بھائی شوکت علی، کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر تھیوڈور بیک (1859ء - 1899ء) اور مولانا شبلی نعمانیؒ (1857ء - 1914ء) تھے۔ جسطرح شوکت علی علی گڑھ کالج میں ایک حلقے کے لیڈر تھے، محمد علی نے نسبتاً کم عمر لڑکوں میں اپنے لئے بھی ایسا ہی مقام پیدا کر لیا تھا۔ شوکت علی طالب علموں کے رہنما تھے۔ ان کے مسائل کا حل تلاش کرتے۔ ان کے تنازعات کا فیصلہ کرتے۔ استادوں سے نوک جھوک بھی ہوتی۔ یونین کے سیکریٹری بھی رہے اور کرکٹ کے کپتان بھی۔ محمد علی غیر شعوری طور پر انکے نقش قدم پر چلتے رہے۔ انکا اپنا حلقہ، اپنی شرارتیں اور شوخیاں تھیں۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود علی گڑھ کالج ہی وہ سرزمین ہے جس نے محمد علی کی اسلام سے شدید رغبت بڑھائی۔ انکے دل میں جو چنگاری محصور تھی۔ اُسے مولانا شبلی نعمانیؒ نے شعلہ فشاں دیا۔[26] جسکا اعتراف محمد علی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بڑے فخر سے کیا ہے کہ :-

"علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں علامہ شبلیؒ کے درسِ قرآن اور "اسلام اور اسلامی زندگی" پر انکے لیکچرز نے ماضی کے تسلسل اور اسکی صحت مند روایتوں سے انھیں زندگی بھر جوڑے رکھا۔"[27]

قیام علی گڑھ کے دوران محمد علی نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر خاص و عام سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ 1898ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے امتیازی پوزیشن میں بی۔اے کا امتحان پاس کر کے صوبہ متحدہ میں اول رہے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔[28] مسٹر گوکھلے کی وفات پر انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے دہلی کے ٹاؤن ہال کے میدان میں جلسہ ہوا۔ جسمیں پنڈت مدن موہن مالوی اور سر نیدر ناتھ وغیرہ نے اپنی تقاریر میں کہا کہ مسٹر گوکھلے کا ایک بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے 21 (اکیس) سال کی عمر میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ اس پر محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ :-

"گوکھلے علم و قابلیت کا مجسمہ تھے۔ انکے لئے یہ امور باعثِ فخر نہیں۔ آپکا یہ نیازمند جو گوکھلے سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی میں

اول آچکا ہے۔"[29]

یہ سن کر حاضرین و ناظرین حیرت زدہ رہ گئے۔

اس شاندار کامیابی نے شوکت علی کو محمد علی کے بہتر مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ قبل ازیں انہوں نے کبھی محمد علی کی صلاحیتوں کا بر ملا اعتراف نہیں کیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد نہ صرف انہیں معترف ہونا پڑا۔ بلکہ اپنے سابقہ غیر ذمہ دارانہ رویے کی تلافی کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شوکت علی علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد محکمہ افیون میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ علی گڑھ کالج کے دستور کے مطابق محمد علی کو کالج کی طرف سے نامزد کیا گیا کہ حکومت انہیں مجسٹریٹ بنادے یا لینڈ ریونیو کا عہدہ دے دے۔ ایسی صورت میں محمد علی کو ملازمت کے آغاز ہی میں اتنی تنخواہ مل جاتی جتنی شوکت علی کو اپنی ملازمت کے آغاز سے لیکر پندرہ سال تک بھی میسر نہ آئی۔[30] لیکن شوکت علی نے تمام معاشی پریشانیوں اور خانگی مسائل کے باوجود فیصلہ کیا کہ وہ محمد علی کو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرانے کیلئے انگلستان بھیجیں گے۔ انکا خیال تھا کہ محمد علی کو اعلیٰ سرکاری ملازمت کیلئے اہل بنائیں۔ تاکہ مالی پریشانیوں سے نجات مل سکے۔ دوسرا یہ کہ اپنے آپکو معاشی، سماجی اور سیاسی طور پر مستحکم کرنے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کیلئے آئی۔ سی۔ ایس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ خانگی مسائل کی موجودگی میں محمد علی کے تعلیمی مصارف کیلئے کم سے کم رقم کا انتظام کرنا بھی کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ لیکن بڑے بھائی شوکت علی نے یہ معجزہ کر دکھایا اور محمد علی کو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرانے کیلئے لندن بھیج دیا۔ محمد علی کو بھائی کے جذبہ ایثار پر بڑا فخر تھا۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا۔ پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔"[31]

محمد علی کو بغرض تعلیم لندن بھیجنے کیلئے مالی ضروریات و اخراجات پورے کرنے میں شوکت علی کے علاوہ نواب اسحٰق مدار المہام ریاست رامپور نے اہم کردار ادا کیا۔ انکی بھرپور کوششوں کے نتیجے میں نواب رامپور حامد علی خاں (1875ء - 1930ء) نے وظیفہ کی منظوری دے دی۔ لیکن مشروط طور پر کہ انگلستان سے واپسی پر محمد علی اس وقت تک ریاست رامپور کی ملازمت کرتے رہیں گے جب تک وظیفے کی رقم پوری نہیں ہو جاتی۔[32]

قیام انگلستان (1898ء - 1902ء) کے آغاز ہی میں محمد علی نے ادبی و سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں کوپر فیلی، مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج، مسٹر آرنلڈ پروفیسر عربی علی گڑھ کالج، مسٹر ہیمس (MR. Haymes) پرنسپل کاونٹی ہائی سکول لندن وغیرہ کے خاندان سرفہرست تھے، جنکے ساتھ محمد علی کے خوشگوار مراسم قائم ہوئے۔ انکے ساتھ ادب، فلسفہ، تاریخ اور سیاسیات کے موضوعات پر بحث و تمحیص میں اچھا وقت گذارا۔ لندن کی علمی و ادبی اور سماجی تقریبات و سرگرمیوں میں شرکت سے محمد علی کو یہاں کے لوگوں کے نظریات و خیالات، عادات و خصائل، معاشرتی ماحول اور سماجی اداروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں کے منفی و مثبت دونوں پہلوؤں کا بنظرِ غائر جائزہ لیا۔ اس تمام عرصے میں میاں فضل حسین (1877ء - 1936ء) جو آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے

کیلئے پہلے سے لندن میں مقیم تھے، محمد علی کیساتھ ہوتے تھے۔ محمد علی نے لندن میں چند ماہ میاں فضل حسین کے ساتھ اسی مکان میں قیام کیا، جو مسٹر ہیمس کی ملکیت تھا۔[33]

چند ماہ لندن گذارنے کے بعد محمد علی آکسفورڈ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے حسبِ دستور ممبر آف یونیورسٹی کا امتحان پاس کرنے کے بعد لنکن کالج میں داخلہ لے لیا۔ محمد علی کو آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کی تیاری کے سلسلے میں ریاضی، جغرافیہ، قانون اور نظم و نسق جیسے خشک مضامین کا مطالعہ کرنا پڑا، جنکے کے لیے میلانِ طبع مفقود تھا۔ بلکہ طبیعت پر ادب و تاریخ کا گہرا ذوق غالب تھا۔ وہ نصابی مضامین میں محنت کرنے کی بجائے تاریخ، ادب، فلسفہ، سیاسیات اور لبرل ازم سے متعلق مضامین میں دلچسپی لیتے رہے۔ جو انکی افتادِ طبع کے موافق تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس مقصد یعنی آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے گئے تھے اس میں ناکام ہوگئے۔ محمد علی کے علاوہ دیگر فیل ہونے والے انکے رفقاء میں فضل حسین، (جو انتہائی سنجیدہ اور محنتی تھے) سی۔ آر۔ داس، سر شادی لال، سر شاہ محمد سلیمانArbindo GhoseاورManmohan Ghose تھے۔ بعد ازاں جنہوں نے تاریخ میں بڑا اہم مقام پیدا کیا۔ اگرچہ محمد علی مطلوبہ امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن انہوں نے انگلستان میں رہ کر ایک آزاد قوم کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ آزادی کے مظاہر دیکھے، آزادی اور غلامی کا تجزیہ کیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں محمد علی نے اپنے غلام ملک ہندوستان اور آزاد ملک انگلستان کا موازنہ کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ غلامی سے نجات اور آزادی کے حصول کیلئے انسان کو کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی آئندہ زندگی اسی نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وقف ہوئی اور وہ آزادی کے آتش زیرپا نقیب بنے۔ اس سلسلے میں مختلف آزاد قوموں کی تاریخ و سیاست اور معاشرت کا مطالعہ محمد علی کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ بقول محمد علی

> "الغرض مجھے آکسفورڈ میں جہاں سے میں نے تاریخِ جدید میں آنرز کی ڈگری حاصل کی تھی، مجھے بہت اچھا موقع ملا کہ میں نے اپنے School کیلئے عام تاریخ کا مضمون لیا تھا۔ اس ضمن میں اپنے ہم مذہبوں کی تاریخ کے ایک حصے سے اچھی طرح واقف ہوگیا، جو مشتمل تھا اسلامی سلطنت کے آغاز اور اسکے عروج پر۔ اور اس میں شروع کی صلیبی جنگوں کا زمانہ بھی آتا تھا۔ لیکن اسکے باوجود میں مذہب کے بارے میں جو عہدِ قدیم کے مسلمانوں کیلئے تلوار او ڈھال دونوں تھا، آکسفورڈ میں مزید کچھ نہ پڑھ سکا۔"[34]

محمد علی کے اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ دنیاوی اور جدید علوم کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اسلامی تعلیم کو ضروری خیال کرتے تھے۔ خصوصاً اپنے اندر اس کی کو وہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ بعد ازاں اس کمی کو انہوں نے اپنے زمانہ اسیری و نظربندی میں مطالعہ قرآن و اسلامی کتب سے دور کیا۔ وہ صرف ذاتی طور پر ہی نہیں بلکہ اجتماعی و قومی سطح پر جدید علوم کے ساتھ اسلامی علوم کی ترویج چاہتے تھے۔ بعد ازاں تحریک خلافت کے دوران عدم تعاون اور ترک موالات کا آغاز ہو، تو محمد علی نے علی گڑھ کالج کی انتظامیہ سے اختلاف کرتے ہوئے الگ سے ایک ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور بحثیت شیخ الجامعہ اس کا نصاب مرتب کیا۔ جو مکمل طور پر اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ تھا۔ اس طرح محمد علی کی بے چین روح کو کچھ تسکین ملی۔ لیکن پھر سیاست کی خارزاروادی میں ایسے الجھے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو وقت ہی نہ دے سکے۔

اگرچہ محمد علی مطلوبہ مضامین میں عدم دلچسپی کی وجہ سے ناکام ہوگئے۔ لیکن اس ناکامی میں خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے مصلحت پوشیدہ تھی۔ کہ یہ جوہر ملت سول سروس کی نمک کی کان میں جاکر محکومی کا نمک بننے کی بجائے ملک و قوم کے کام آئے۔ اس ناکامی نے محمد علی کو سول سروس کے مابعد اثرات و نتائج سے بچالیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ واقعی ملک و قوم کیلئے گوہر نایاب ثابت ہوئے۔ محمد علی آئی۔ سی۔ ایس میں اپنی ناکامی کی وجہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ :۔

> " یہ انگلستان میں موسم بہار اور نوجوان شخص کے غیر دانشمندانہ فیصلہ کے باعث ہوا۔"[35]

انگلستان کے موسم بہار سے مراد وہاں کی خوشگوار علمی و ادبی شامیں، ہندوستانی و یورپین حلقہ احباب، جن میں حاکم بڑودہ کے صاحبزادے فتح سنگھ، (جنکی سفارش پر بعد میں محمد علی کو ریاست بڑودہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔) کنور جگدیش پرشاد جنکا تعلق مرادآباد کے شاہی خاندان سے تھا اور عبدالوحید خان جو جنرل اعظم خان کے عزیز تھے، یہ سب محمد علی کے آکسفورڈ میں ہم جماعت تھے[36] علاوہ ازیں سماجی و غیر نصابی سرگرمیاں ہیں جنکا میاں فضل حسین نے اپنی غیر مطبوعہ ڈائری میں مفصل تذکرہ کیا ہے۔ جن میں محمد علی بھرپور انداز میں دلچسپی لیتے رہے، مگر اخلاقیات کے اندر رہتے ہوئے۔ جسکا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی (1893ء - 1977ء) کو لکھتے ہیں کہ :۔

> " کالج چھوڑا تو ولایت جانا پڑا۔ جہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہیں تھی۔ مگر ذوقِ نظارۂ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی۔ تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستور عام زہد و تورع کی طرف مائل تھا۔"[37]

محمد علی کی آئی۔ سی۔ ایس میں ناکامی نے شوکت علی کے مستقبل کے تمام خواب چکنا چور کر دیئے۔ لیکن انکی والدہ نے حوصلہ نہیں ہارا۔ 1902ء میں بیٹے کو ہندوستان بلایا اور عظمت علی خان کی بیٹی امجدی بیگم (1885ء - 1947ء) سے شادی کرنے کے بعد دوبارہ اسی سال واپس انگلستان بی۔ اے آنرز کا امتحان دینے کیلئے بھیج دیا۔ محمد علی نے آکسفورڈ سے "جدید تاریخ" میں بی۔ اے کا امتحان شاندار کامیابی سے پاس کیا اور 1902ء ہی میں رامپور کے پہلے آکسفورڈ گریجویٹ کی حیثیت سے ملک واپس آئے۔[38]

پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز

محمد علی جب ہندوستان واپس آئے تو ہندوؤں کی نمائندہ سیاسی جماعت کانگریس کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ملک کے سیاسی افق پر چھا گئی تھی۔ جس وقت آپ انگلستان گئے تھے کانگریس کو قائم ہوئے تقریباً ایک عشرہ سے زائد ہو چکا تھا۔ کانگریس کے قیام 1885ء سے پہلے ہندوؤں کی بہت سی تنظیمیں مثلاً برہمو سماج، پرارتھنا سماج، دیو سماج، آریہ سماج اور گئو رکھشا سبھا وغیرہ قائم ہو چکی تھیں[39] لیکن ان میں سے کسی کو بھی ملک گیر حیثیت حاصل نہ تھی۔ ہندوؤں کی اس قسم کی تحریکیں اور تنظیمیں جنکا مقصد بظاہر مذہب کی اصلاح تھا۔ مگر درحقیقت ہندو قومیت کا سیاسی فروغ تھا، یکے بعد دیگرے وجود میں آرہی تھیں۔ انگریزوں کی خواہش کے مطابق ایک ریٹائرڈ انگریز آئی۔ سی۔ ایس آفیسر مسٹر اے۔ او ہیوم Hume

(1829ء -1912ء) کی تجویز پر 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوؤں کی ملک گیر سیاسی جماعت معرض وجود میں آئی۔ بقول سید حسن ریاض

> "ہندوؤں کے پاس پہلے ہی سے بہت سی انجمنیں موجود تھیں مثلاً انڈین ایسوسی ایشن بمبئی ، مدراس میں مہاجن سبھا اور پونا میں سروجنک سبھا۔ ہندوؤں میں تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے، مگر سب صوبائی۔ پورے ہندوستان کی ایک انجمن کوئی نہ تھی۔" [40]

کانگریس کے قیام نے اس کمی کو پورا کر دیا۔ کانگریس نے کیوں اور کن حالات میں جنم لیا۔ اس بارے میں کانگریس کے ممتاز لیڈر پٹابھی سیتارامیا تحریر کرتے ہیں کہ :-

> "مسٹر ہیوم برطانوی عہدہ دار تھے۔ انکو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ کہیں یکایک شورش پھیل جائے، پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت ہو جائے۔ اس پر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام قائم ہونا چاہیے جس سے برطانوی حکومت ان سازشوں سے محفوظ رہ سکے۔" [41]

کانگریس سرکاری سرپرستی میں پروان چڑھی۔ بظاہر کانگریس کے اغراض و مقاصد کا تعلق تمام ہندوستانیوں سے تھا۔ اس نے "کل ہند" جماعت کا حسین نعرہ لگایا۔ اور ہندوستان کے لوگوں کو حکومت کے نظم و نسق میں حصہ دلوانے کی مہم شروع کی۔ لیکن حقیقت میں یہ صرف اور صرف ہندوؤں کی جماعت تھی۔ نمائندہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے کانگریس ملک گیر حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے پاس حقوق کی طلبی اور تحفظ کے لیے کوئی مضبوط سیاسی پلیٹ فارم نہ تھا۔ ملک واپسی کے وقت محمد علی کے ذہن میں بھی قوم کے بارے میں کوئی سیاسی خاکہ نہ تھا۔ اس لئے تلاشِ معاش میں سرگرداں ہوئے۔ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے لارڈ کرزن (1859ء- 1925ء) تھے۔ 1891ء میں وزیرِ ہند کی حیثیت میں وہ ہندوستانی معاملات کو بطریق احسن جان چکے تھے۔ سیاسی حلقوں میں انکی دانائی اور تدبر کا سکہ جما ہوا تھا۔ کرزن 1899ء سے 1905ء تک ہندوستان کے وائسرائے رہے۔ انہوں نے لارڈ ولزلی (بحیثیت گورنر جنرل 1798ء -1805ء) اور لارڈ ڈلہوزی (بحیثیت گورنر جنرل 1848ء -1856ء) کی حکمت عملی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں اصلاحات کا نفاذ کیا۔ اس نے والیانِ ریاست کو سلطنت کا رکن ٹھہراتے ہوئے ایک "امپیریل کیڈٹ کور" بنائی جسمیں راجوں، مہاراجوں اور نوابوں کے بیٹوں کو فوجی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ جسکے کل اخراجات ریاستوں کے ذمے تھے۔ اگرچہ اس پر والیان ریاست نے ناراضگی کا اظہار کیا مگر وہ کچھ نہ کر سکے۔ جنگ عظیم کے دوران لارڈ کرزن کا یہ کام حکومت برطانیہ کیلئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ مالگزاری کے انتظام میں خرابیوں کے خاتمے کیلئے 1900ء میں قانون انتقالِ اراضی نافذ کیا۔ زمینداروں کی زمین گراں قدر سود در سود کی وجہ سے ساہوکاروں کے قبضہ میں جا رہی تھیں۔ اس قانون نے زمینداروں کو بے زمین ہونے سے بچالیا۔ اس کے ساتھ ہی سود در سود سے چھٹکارے کیلئے زمیندارہ بنک یعنی کواپریٹو کریڈٹ سوسائٹیاں قائم کیں اور زراعتی کالج بھی قائم کئے۔

لارڈ کرزن نے تعلیم کو اعلیٰ و جدید معیار کے مطابق ڈھالنے کیلئے یونیورسٹی ایکٹ پاس کیا۔ جسکی رو سے

یونیورسٹیوں کا کام امتحان لینے کے علاوہ تحقیقات و سائنس کی تعلیم دینا بھی تھا۔ مگر ہندوستانیوں نے سمجھا کہ اس ایکٹ کا مقصد تعلیم کو محدود کرنا ہے۔ لہذا تعلیم یافتہ طبقے نے بھی اسکی پرزور مخالفت کی۔ محمد علی جو جدید تعلیم کی اہمیت اور ضرورت سے واقف تھے۔ انہوں نے تعلیمی اصلاحات پر اطمنان کا اظہار کیا۔ کرزن کی تعلیمی اصلاحات پر محمد علی کا اطمنان اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تعلیم کو قومی اہمیت دیتے تھے۔ لارڈ کرزن نے "تحفظ آثار قدیمہ" کا قانون بھی پاس کیا۔ جس کے تحت محکمہ آثار قدیمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس محکمہ نے نہ صرف پرانی یادگاروں کو منہدم ہونے سے بچایا۔ بلکہ بہت سی پرانی آبادیاں جو انقلابِ زمانہ سے زمین کے نیچے دب چکی تھیں انکو کھود کھود کر نکالا۔ موریا خاندان کے محلات کے کھنڈرات، ٹیکسلا میں بدھ کے زمانے کی تاریخی عمارتیں، ہڑپہ ضلع ساہیوال میں سندھ کی قدیم تہذیب کے نشانات اسی محکمہ کی کوششوں کا ثمر ہیں۔ لارڈ کرزن نے شمال مغربی سرحد پر چوکیاں بنائیں اور ان چوکیوں کی حفاظت کیلئے پٹھانوں کی ملیشیا فوج بھرتی کی۔ مشہور سرحدی مقامات کو ہندوستانی چھاؤنیوں سے بذریعہ ریل اور سڑکیں ملادیا۔ اسکے علاوہ دریائے سندھ کے پار علاقے کو 1901ء میں پنجاب سے الگ کر کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ بنادیا۔ جسکی نگرانی چیف کمشنر کے سپرد کر دی۔ لیکن عام طبقے نے اس سے یہ تاثر لیا کہ اس صوبے کا مقصد پنجاب اور سرحد کے باہمی اتحاد کو ختم کرنا ہے۔ اگر تنقید برائے تنقید کی جائے غیر جانبداری سے لارڈ کرزن کے ان اقدامات کا جائزہ لیا جائے تو یہ اقدامات یقیناً انتظامی مسائل کے حل اور عوامی فلاح کیلئے تھے۔ برار کا علاقہ جو 1853ء میں نظام حیدرآباد نے انگریزوں کو امدادی فوج کے اخراجات پورے کرنے کیلئے عارضی طور پر دیا تھا۔ لارڈ کرزن نے اپنے عہد میں اس کو مستقلاً پٹہ پر حکومت برطانیہ کے قبضہ میں لے لیا۔[42]

لارڈ کرزن نے داخلہ پالیسی کے علاوہ خارجہ پالیسی کی طرف بھی توجہ دی۔ 1901ء میں عبدالرحمٰن خان والئی افغانستان کی وفات پر اسکا بڑا بیٹا حبیب اللہ خان امیر بنا تو انگریز حکومت نے اس کو امیر تسلیم کرتے ہوئے اسکے ساتھ معاہدہ کیا۔ جسکی رو سے والئی افغانستان کو امیر کی بجائے شاہ کا خطاب دیا گیا۔ تبت حکومتِ چین کا ماتحت صوبہ تھا مگر اسکا حکمران خود مختار تھا۔ تبت میں روس بغرض تجارت آیا اور آہستہ آہستہ اپنا اقتدار جمانا شروع کر دیا۔ کرزن کی دوربین نگاہوں نے پاک و ہند کے مستقبل کے خطرے کو بھانپ کر حاکم تبت دلائی لامہ سے راہ و رسم پیدا کرنا چاہی۔ مگر اس نے چنداں پرواہ نہ کی۔ لہذا لارڈ کرزن نے 1904ء میں ہندوستان سے ایک لشکر بھیجا جو تبت کے دارالحکومت لاسہ تک جا پہنچا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ دلائی لامہ کو برطرف کر کے نیا لاسہ کو حکمران مقرر کر دیا۔ جس نے انگریز ریذیڈنٹ رکھنا منظور کیا اور چمپاوادی 75 سال تک کیلئے انگریزوں کے حوالے کر دی۔ اس کے ساتھ ہی تبت سے روسی اقتدار کا امکان تک ختم ہو گیا۔[43] لارڈ کرزن کی خارجہ پالیسی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے اسکو بیرونی ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ واقعی صحیح ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے۔ اور پھر طاقت و اقتدار بھی پاس ہو تو دوسروں کی کمزرویوں سے فائدہ اٹھانا قدرتی امر ہے۔

لارڈ کرزن نے 1905ء میں انتظامی ضروریات کے تحت بنگال کے مشرقی حصے کو آسام کمشنری سے ملا کر ایک نیا صوبہ مشرقی بنگال و آسام بنادیا۔ جسکا پایۂ تخت ڈھاکہ بنا۔ لیکن بنگالی ہندوؤں نے لارڈ کرزن کے اس اقدام کو سیاسی چال قرار دیا۔ محمد علی جو لارڈ کرزن کی اصلاحات اور ملک کے اندر نئے نئے اقدامات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ تقسیم

بنگال کے سلسلے میں انہوں نے لارڈ کرزن کی مخالفت کی۔ انکے نزدیک کرزن کا یہ اقدام ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ جس پر محمد علی نے کھل کر تنقید بھی کی۔ کرزن نے ملکی امن وامان کی بحالی کیلئے پولیس اصلاحات نافذ کیں۔ انکی سابق تنخواہوں میں اضافہ کر کے انکی شکایات کو دور کیا۔ انکی تربیت کیلئے پولیس کمیشن کا تقرر کیا۔ مالی اصلاحات بھی نافذ کیں۔ انکم ٹیکس پانچ سو روپے سالانہ آمدنی کی بجائے ایک ہزار روپے سالانہ آمدنی پر لاگو کیا۔ نمک کے محصول میں نصف کے قریب کمی کر دی۔ وائسرائے کی انتظامی کونسل کی زیر نگرانی صنعت و حرفت کی ترقی کیلئے محکمہ قائم کیا۔ ریلوں اور نہروں کی اصلاحات کیلئے کمیشن مقرر کیئے۔

یہ وہ دور تھا جب محمد علی ریاست بڑودہ میں ملازم تھے۔ وہ ترقی پسند تھے۔ لہذا ترقی پسندانہ اور ملکی استحکام وخوشحالی سے متعلق اقدامات کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔ اس لیے وہ کرزن کی اصلاحات سے مطمئن تھے۔ اور انہیں ترقی وخوشحالی کے ضمن میں بہتر پیش رفت سمجھتے تھے۔ کرزن کے عہدہ کی معیاد 1904ء میں ختم ہونے والی تھی۔ مگر بہتر کارکردگی اور اصلاحات کی بنا پر انہیں مزید دو سال اسی عہدے پر مامور رہنے دیا گیا۔ اس زمانے میں کمانڈر انچیف مکمل بااختیار نہیں تھا اس کا فیصلہ بعمل وائسرائے اور اسکی انتظامی کونسل کے ماتحت تھا۔ دریں اثناء لارڈ کرزن اور لارڈ کچنر کمانڈر انچیف میں ٹھن گی۔ اختلاف اس حد تک بڑھا کہ وزیر ہند کو مداخلت کرنا پڑی اور اس نے فوجی اصلاحات کا کلی اختیار کمانڈر انچیف کو دے دیا۔ جو کرزن کی ناراضگی میں اضافے کا باعث بنا۔ اور بالآخر انہوں نے 1905ء میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔[44]

جب محمد علی ہندوستان آئے تو حالات معمول کے مطابق تھے۔ کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بلکہ کرزن کے اقدامات واصلاحات کی وجہ سے صورتحال اطمینان بخش تھی۔ دوسری طرف کانگریس کی روش بھی اعتدال پسندانہ تھی۔ محمد علی میدان سیاست میں قدم رکھنے کی بجائے روزگار کی تلاش میں سرگرداں ہوئے۔ کیونکہ خانگی ومعاشی مسائل سے نمٹنے کیلئے بہتر ملازمت کا حصول از حد ضروری تھا۔ محمد علی علی گڑھ کالج میں پڑھانے کی شدید خواہش رکھتے تھے جس سے انہیں والہانہ محبت تھی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل مسٹر تھیوڈور ماریسن تھے۔ جو محمد علی کی انگریزی قابلیت ولیاقت اور صلاحیتوں کے معترف تھے۔ لیکن وہ محمد علی جیسے جرأت مند، حق گو، بے باک اور ناقدانہ صلاحیتوں کے حامل شخص کو بطور استاد علی گڑھ کالج میں قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں بھی محمد علی کی بے باکی کے بارے میں مسٹر ماریسن کی رائے کوئی اچھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو ہندوستانی سٹاف کے مقابلے میں یورپین سٹاف کو نوازنے اور انہیں لامحدود اختیارات دینے کی پالیسی پر گامزن تھے۔ مسٹر ماریسن جیسے سیاہ وسفید کے مالک شخص کو جو کہ ہندوستان کے سیاسی معاملات میں بھی اتنا ہی بااختیار تھا جتنا کہ تعلیمی امور میں۔ انہیں بھلا محمد علی جیسا شخص کیسے پسند آسکتا تھا جو لامحدود اختیارات اور غلط پالیسیوں پر کڑی تنقید کرنے والا ہو۔ حالانکہ علی گڑھ کالج کے آنریری سیکریٹری نواب محسن الملک (1837ء - 1907ء) جو محمد علی کی قابلیت وصلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے، خواہش مند تھے کہ ان سے استفادہ کیا جائے۔ وہ محمد علی کی ملازمت کے لیے دی ہوئی درخواست کے حامی ہوئے۔ مگر نواب محسن الملک کی حمایت اور رضامندی کے باوجود مسٹر ماریسن نے محمد علی کی درخواست مسترد کر دی۔ بقول ایس۔ ایم۔ اکرام

"لیکن وہ ذہنیت جو انگلش سٹاف اس درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا جوہر سمجھتا تھا محمد علی میں موجود نہ تھی۔ اسلیئے ماریسن صاحب کی سخت مخالفت سے درخواست مسترد ہو گئی۔"[45]

مسٹر تھیوڈور ماریسن جو علی گڑھ کالج میں سینئر پروفیسر تھے۔ ستمبر 1899ء میں مسٹر بیک کے انتقال کے بعد کالج کے پرنسپل بنے۔ سر سید انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ طلباء پر انکا خاص اثر تھا۔ باہمی نزاعات سے وہ اپنے آپکو یکسر الگ رکھتے تھے۔ لیکن اردو ہندی تنازعہ کے سلسلے میں سر انٹونی میکڈانل نے انہیں حکومت اور سیکرٹری کے درمیان ذریعہ بنا کر انکا درجہ سیکرٹری سے بالاتر کر دیا۔ اور پھر لارڈ کرزن کی خاص عنائتوں نے امپریل لیجسلیٹیو کونسل کا عارضی ممبر نامزد کر کے متقدم جانشینوں کے مقابلے میں انکا وقار و اقتدار مزید مستحکم کر دیا تھا۔[46] یہ اسی اقتدار و اثر کا نتیجہ تھا کہ مسٹر ماریسن کے ذہین میں یہ بات پختہ ہو گئی تھی کہ آنریری سیکرٹری نواب محسن الملک سٹاف پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی انکی نگرانی کر سکتے ہیں۔ اسلیئے انکی خواہش کے باوجود مسٹر ماریسن نے محمد علی کی ملازمت کے سلسلے میں دی گئی درخواست کو مسترد کر دیا۔ مسٹر ماریسن علی گڑھ کالج اور ملکی سیاسی فضا پر مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے اور اپنی من مانی کاروائیوں سے مسلمانوں کو کٹھ پتلی بنا رکھا تھا۔ کالج پرنسپل اور انگریز سٹاف کی مسلمانوں کے تعلیمی و سیاسی معاملات میں مداخلت اور اکھاڑ پچھاڑ سے محمد علی کے دل میں جو نفرت پیدا ہو گئی تھی، مسٹر ماریسن کے جانبدارانہ رویے سے مزید جاگزیں ہو گئی۔ اور کالج کے معاملات میں انکی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کالج کی ملازمت سے الگ رہ کر قدرت نے محمد علی کو آزادانہ اور بے باکانہ تعمیری تنقید کا موقع فراہم کر دیا۔ شاید ملازمت کی حدود و قیود اور قواعد و ضوابط میں وہ ایسا نہ کر سکتے۔ جو انہوں نے آئندہ وقتوں میں کیا۔

محمد علی کا طبعی میلان درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کے شعبوں میں زیادہ تھا۔ وہ قابلیت کے اس معیار پر پورا بھی اترتے تھے۔ جو ایک اچھے استاد کا گوہر سمجھی جاتی ہے۔ سووالئی رامپور نواب حامد علی خان نے انہیں ریاست میں چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر کر دیا۔ ساتھ ہی رامپور ہائی اسکول کی پرنسپل شپ کے فرائض بھی سونپ دیئے۔[47] زمانہ طالب علمی ہی سے محمد علی کو اس چیز کا شدید احساس تھا کہ مدارس میں مذہبی تعلیم کا کوئی صحیح بندوبست نہیں ہے۔ وہ جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ خود بھی اس چیز کا اعتراف کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ و جدید تعلیم و تربیت کے باوجود مذہبی تعلیم سے محروم رہے۔ بقول محمد علی

" ہمیں یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ اس ساری اخلاقی اور روحانی تربیت کے ہوتے ہوئے بھی، جو ہم نے اپنی والدہ سے حاصل کی خواہ عملی لحاظ سے اسکی اہمیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ ہم دین اسلام اور تاریخ اسلام کے تفصیلی علم سے بالکل کورے رہے۔ اور اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ہم ایک ایسے اسکول میں بھیجے گئے۔ جہاں ہمیں یورپ کی نئی خدا ناشناس تعلیم حاصل کرنی پڑی۔ جہاں اللہ، اسکے رسول ﷺ اور قرانِ مجید کا ذکر تک نہ ہوتا تھا۔"[48]

آکسفورڈ میں بھی محمد علی مذہب سے بیگانہ نہ رہے۔ انہوں نے ہندوستان سے اپنے مطالعہ کیلئے قرانِ مجید منگوایا۔ جسکا باقاعدگی

کے ساتھ نہ سہی لیکن مطالعہ ضرور کرتے تھے۔ قرآن فہمی سے ناواقفیت پر وہ اکثر بعد میں تاسف کا اظہار کرتے کہ :۔

> " مجھے یہاں نہایت ندامت کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ وہ ایک کتاب جسکا مجھے سب سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیئے تھا۔ اسے میں اتنا نہ پڑھ سکا، جتنا مجھے اسکو پڑھنا چاہیے تھا۔ اور گو میں نے بظاہر اس وقت اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ لیکن جیسا کہ بعد میں مجھے اسکا احساس ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت تک میں نے اپنی تعلیم شروع بھی نہ کی تھی۔" [49]

ان نظریات و خیالات کے حامل محمد علی کو جب بحیثیت ایجوکیشن آفیسر رامپور میں ان خامیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے دائرہ اختیار میں رہ کر تعلیمی اصلاحات نافذ کیں۔ ہندو اور مسلم طلبہ کے الگ مذاہب کے پیشِ نظر انکے لئے مذہبی عبادات کی بجاآوری کا علیحدہ انتظام کیا۔ محمد علی چاہتے تھے کہ وہ تعلیمی میدان میں قدیم وجدید کا حسین امتزاج پیدا کر دیں۔ جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ مذہبی وبنیادی تعلیم کے تمام پہلوں پر محیط ہو۔ لیکن یہاں محمد علی یہ بات بھول گئے کہ جاگیر دارانہ نظام میں اپنی پسند و ناپسند کی بجائے ہر کام محدود دائرے میں رہتے ہوئے حکامِ وقت کی آشیرباد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نواب حامد علی خان جو روائتی حکمران تھے۔ اس قسم کی اصلاحات کے حق میں نہ تھے۔ کیونکہ وہ اپنی ریاست میں کوئی بھی ایسا اقدام نہیں چاہتے تھے جس سے انگریز حکومت کی ناراضگی کا خطرہ ہو۔ نواب صاحب کا ریاستی اقتدار و حکمرانی انگریز کے اشارۂ ابرو کا مرہونِ منت تھا۔ محمد علی کی ان تعلیمی اصلاحات میں اسلامی اور بین الملی جذبہ کار فرما تھا، جسکے انگریز شاکی تھے۔ لہذا نواب صاحب نے محمد علی کی ان مخلصانہ کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ مخالفین نے جو محمد علی کی روز افزوں ترقی اور عروج سے نالاں تھے فائدہ اٹھایا۔ جوڑ توڑ اور ریشہ دوانیاں جو کہ ریاستی نظام کا خاصا ہیں، اسپر عمل کرتے ہوئے محمد علی پر سازش کا الزام لگایا،[50] کہ زمانہ آکسفورڈ میں محمد علی نے ناصر علی خان جو نواب حامد علی خان کے برادر خورد تھے، ان سے عہد و پیمان کیا تھا کہ وہ نواب (حامد علی خان صاحب) کو اقتدار سے ہٹا کر انہیں (ناصر علی خان) رامپور کا فرمانروا بنانے کی ہرممکن کوشش کریں گے۔ اس الزام کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ محمد علی کے پاس اس وقت ایسا کونسا اختیار، طاقت یا عہدہ تھا جسکو کام میں لاتے ہوئے وہ ایسا کرتے۔ اگرچہ دولت میں طاقت ہے انکے پاس تو وہ بھی نہیں تھی جس پر انہیں گھمنڈ ہوتا۔ لیکن سازش رنگ لائی۔ نواب صاحب محمد علی سے بدظن ہو گئے اور قصداً انہیں ہر سرکاری وغیر سرکاری تقریب سے الگ رکھا جانے لگا۔ حتیٰ کہ اختیارات کا دائرہ بھی محدود کر دیا گیا۔ یہ چیز محمد علی جیسے خوددار اور آزاد منش شخص کیلئے باعث اذیت تھی کہ انکی ایمانداری، قابلیت، بے غرض اور انتھک محنت کو منفی رنگ دیا جا رہا ہے۔ اور پھر محمد علی جیسے نظریاتی اور متحرک شخص ریاستی پابندیوں میں جکڑ کر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک سال بعد ہی رامپور کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا۔[51]

محمد علی کے زمانہ آکسفورڈ سے کنور فتح سنگھ ولی عہد بڑودہ کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے اپنے والد مہاراجہ بڑودہ سیایاجی راؤ گیکوارڈ کو محمد علی کی صلاحیتوں اور قابلیت سے استفادہ کرنے کا مشورہ دیا۔ کنور فتح سنگھ کی کوشش اور تحریک سے محمد علی کو ریاست بڑودہ میں محکمہ افیون کے اعلیٰ آفیسر یعنی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ دے دیا گیا۔ رامپور کی

نسبت بڑودہ کے حالات حوصلہ افزاء تھے۔ جہاں محمد علی نے سات سال تک اپنے فرائض نہایت دیانت، مستعدی اور راست بازی سے سرانجام دیئے۔ ریاست کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ کروایا۔ مہاراجہ بڑودہ نے انکی کارپردازی سے خوش ہوکر انہیں ضلع نوساری کا کمشنر مقرر کر دیا۔ بحیثیت کمشنر محمد علی نے متعدد اصلاحات نافذ کیں اور خصوصاً گراں قیمت پر زمین کی خریداری سے متعلق غریب طبقے پر ظلم کا خاتمہ کرادیا۔ کمشنری کے بعد ولی عہد کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ ہوگئے۔ آپکے اخلاقِ جمیلہ اور اوصاف حمیدہ نے ریاست کے تمام باشندوں کو آپکا گرویدہ بنادیا۔ آپکی دیانت کا یہ عالم تھا کہ رشوت تو درکنار نذرانہ بھی نہ لیتے تھے۔[52]

دوران ملازمت بڑودہ محمد علی، علی گڑھ کالج کی تعمیر و ترقی میں برابر دلچسپی لیتے رہے۔ انکی خواہش تھی کہ یہ ادارہ جلد از جلد ترقی کر کے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرے۔ 1904ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا تو محمد علی نے کانفرنس میں مجوزہ محمڈن یونیورسٹی کی ضرورت اور قیام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔[53] انہوں نے حقیقی اور تعصب سے پاک تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے دلائل سے واضح کیا کہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جارہی ہے وہ تعمیر کی بجائے تخریب کا سبب بن رہی ہے۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل نصف گریجویٹس تو فرقہ وارانہ مسئلے اور سوچ میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں ضائع کر دیتے ہیں۔ بجائے اسکے کہ انہیں وطن سے محبت، رواداری اور دوسرے کے مذاہب کے احترام کا درس دیا جائے۔ انہیں عقائد کی بحث میں الجھا کر ہم وطنوں سے منافرت و عداوت کی تعلیم دی جاتی ہے جو ملک کیلئے سمِ قاتل ہے۔[54]

تقسیمِ بنگال 1905ء

گیکوارڈ بڑودہ آزاد خیال اور ترقی پسند انسان تھے۔ اسی وجہ سے محمد علی کو بڑودہ سول سروس کے دوران آزادی اظہار کی اجازت تھی۔ لیکن رامپور میں وہ اس بنیادی حق سے محروم تھے۔ ابھی تک محمد علی ملازمت کی بندشوں کی وجہ سے عملی طور پر میدان سیاست میں نہیں آئے تھے۔ لیکن انکے اندر ملک و قوم کی خدمت اور حقوق کی طلبی کا جذبہ موجزن تھا۔ جسکا اظہار وہ وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں میں کرتے رہتے تھے۔[55] 1905ء میں حکومت نے جن بنیادوں پر بنگال کو تقسیم کیا، محمد علی اسکے خلاف تھے۔ اگرچہ تقسیم بنگال کی ظاہری اور اصولی وجہ تو انتظامی مسائل تھے۔ بنگال ایک وسیع و عریض صوبہ تھا۔ جس میں بہار، اڑیسہ اور آسام شامل تھے۔ تقریباً ایک لاکھ نواسی ہزار مربع میل رقبہ کا صوبہ جو سات کروڑ اسی لاکھ کی آبادی پر مشتمل تھا، جس کا بہتر طور پر نظام چلانا ایک لیفٹیننٹ گورنر کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن محمد علی کے نزدیک دوسری حقیقی اور سیاسی وجہ لارڈ کرزن کا بنگال کو تقسیم کر کے ہندوؤں سے انتقام لینا اور ہندو مسلم طبقات کو آپس میں مزید تقسیم کرنا تھا۔ جسکا اظہار لارڈ کرزن کے ان خطوط سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے اس وقت کے سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا مسٹر ہملٹن کو لکھے تھے۔[56]

محمد علی شروع میں تقسیم بنگال کے مخالفین میں سے تھے۔ دراصل وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے جسکے حصول کے لیے انہوں نے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا حتیٰ کے اس کوشش میں دوستوں کو بھی دشمن بنالیا۔ محمد علی

کے لیے یہ چیز باعث اذیت تھی کے حکومت وقت نے بنگال کی من پسند تقسیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج کو مزید وسیع اور مظبوط کر دیا ہے۔ انہوں نے کرزن کے اس اقدام پر نکتہ چینی کی کہ انہوں نے ہندوؤں سے انتقام لینے کیلئے مسلمان کو آلہ کار بنایا۔[57] ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات ذات پات، مذہب، زمینداری اور کاشتکاری کے فرق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متحدہ بنگال کو اپنی منشا کے مطابق تقسیم کر دیا ہے۔ بقول محمد علی

"---- ایک تو ذات پات کا فرق، دوسرے مذاہب کا، تیسرے زمینداری کا اور کاشتکاری کا، یہ تین طرح کے فرق مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ہنودِ بنگال سے بیگانہ کرنے کیلئے کافی ہو سکتے تھے۔ اور لارڈ کرزن نے اس تفریق سے فائدہ اٹھا کر بنگال کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک مشرقی بنگال جسکو ایک خاصا بڑا صوبہ بنانے کیلئے آسام کے صوبے کو بھی اس میں شامل کر دیا تھا اور دوسرا مغربی بنگال جس میں بہار اور اڑیسہ کو شامل کر دیا تھا۔"[58]

محمد علی نے تقسیم بنگال کو اس vivisection سے مشابہ قرار دیا۔ جو یورپ کے ڈاکٹر جیتے جاگتے حیوانوں کو زخم لگا کر انکی تکلیف کا مشاہدہ کرنے کی غرض سے عمل میں لاتے ہیں۔ کیونکہ تقسیم پر بنگال کے ہندو اور کانگریس تک چیخ پڑے۔ کانگریس میں اس وقت تک تقریباً ہندو ہی تھے۔ محمد علی کا استدلال تھا کہ تقسیم انتظامی نقطۂ نظر سے واقعی ناگزیر تھی۔ جسکا مسلمانوں کو یقیناً فائدہ بھی ہوا۔ اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوئے۔ لیکن انہیں طریقہ کار اور حقیقی غرض و غایت پر اعتراض تھا۔ جسکا اندازہ محمد علی کی درج ذیل تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ بقول محمد علی

"---اگر لارڈ کرزن صوبہ بہار اور اڑیسہ کو صوبہ بنگال سے الگ کر دیتے اور صوبہ آسام کو اسی طرح ایک علیحدہ صوبہ رہنے دیتے تب بھی بنگال کے ہندو ضرور غوغا کرتے۔ لیکن اس کے باعث وہ ہندو مسلم مناقشات رونما نہ ہوتے۔ جو اکتوبر 1905ء کے بعد مشرقی بنگال میں رونما ہوئے۔ اور نہ کانگریسی سیاست میں وہ حرارت پیدا ہوتی۔ جو لارڈ کرزن کے اس فعل (تقسیم بنگال) سے پیدا ہوئی۔ مگر لارڈ کرزن کو تو بنگال کے ہنود سے کلکتے کے روزانہ کے اخبارات کے آئے دن کے اعتراضوں کا بدلہ لینا تھا۔"[59]

اگرچہ بنگال کی تقسیم مسلمانوں کے مطالبے پر نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس سے انہیں ایک اکثریتی صوبہ مل گیا تھا۔ انہیں ہندوؤں کے سیاسی و اقتصادی شکنجوں سے نجات مل رہی تھی۔ تقسیم سے مسلمانوں کو تعلیم اور صوبے کے نظم و نسق میں پہلے سے کہیں زیادہ حصہ ملنے کی توقع تھی۔ خود مختار اداروں کی انتظامیہ پر وہ غالب رہ سکتے تھے۔

نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ (1884ء - 1915ء) نے اس تقسیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :-

"اس تقسیم نے ہماری بے عملی رفع کر دی ہے۔ اور ہمیں مسلسل جدو جہد کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔"[60]

لیکن ہندوؤں کیلئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو جائیں۔ اسلیئے

انہوں نے تمام جمہوری واخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تقسیم کی شدید مخالفت شروع کر دی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے تقسیم بنگال کو متحدہ قومیت کے حق میں ضرب کاری اور پہلے سے سوچی سمجھی ایک نامعقول سکیم قرار دیا۔ بقول سریندر ناتھ بینر جی

> "ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری توہین کی گئی ہے۔ ہمیں ذلیل کیا گیا ہے۔ اور فریب سے کام لیا گیا ہے۔ ہم نے یوں محسوس کیا ہے جیسے ہمارا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اور بنگالی زبان بولنے والوں کے پندار اور انکے بڑھتے ہوئے اتحاد کو ضرب لگائی ہے۔"[61]

حتیٰ کہ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کرتے ہوئے اس کی تنسیخ کے لئے چھ نکاتی پروگرام مرتب کیا۔[62] ہندوؤں کی تقسیم بنگال کے بارے میں مخالفت کی وجوہات اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبید کر نے ان الفاظ میں بیان کی ہیں :۔

> "بنگالی ہندوؤں نے پورے بنگال، آڑیسہ اور آسام حتیٰ کہ یوپی تک کو اپنی چراگاہ بنا رکھا تھا۔ بنگال کی تقسیم کا مطلب یہ تھا کہ انکی چراگاہ کا رقبہ گھٹ جائے گا۔ بنگال کے ہندوؤں کی طرف سے تقسیم کی مخالفت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو انکا حقیقی مقام ملے۔"[63]

1911ء میں مسٹر فریزر Mr. Fraser نے اپنی کتاب "India Undar Curzan and After" میں ہندوؤں کی کم و بیش انہی وجوہات کا ذکر کیا ہے جو تقسیم کے بارے میں مخالفت کا باعث بنیں۔[64]

محمد علی نے تقسیم بنگال کے بارے میں لارڈ کرزن پر جو اعتراض کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ آیا وہ انتظامی مسائل جنکی بنیاد پر بنگال کو تقسیم کیا گیا تھا، 1911ء میں حل ہو گئے تھے کہ تقسیم کو منسوخ کر دیا گیا؟ اور انگریز حکومت تقسیم کو "طے شدہ حقیقت" قرار دینے کے باوجود اپنے وعدے سے پھر گئی۔ دراصل انکا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ایک طرف انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت و اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ دوسرا انگریز حکومت نہیں چاہتی تھی کہ مسلمان من حیث القوم خود مختاری و ترقی حاصل کریں۔

محمد علی اور شملہ وفد 1906ء

تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کے پروپیگنڈہ نے مسلمانوں کو بھی سیاسی بنیادوں پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ نواب سلیم اللہ خان اور انکے رفقاء کار نے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سربلندی، ہنود کی سازشوں سے باخبری، مخالفانہ حملوں کے دفاع اور دشمن پروپیگنڈہ کا جواب دینے کے لیے علیحدہ مسلم تنظیم کی اشد ضرورت ہے۔ لہذا مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی اور معاشی امور میں ترجمانی کیلئے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ جسکا نام "محمڈن پراونشل یونین" (1905ء) رکھا گیا۔[65] سید امیر علی (1849ء - 1928ء) جو سر سید احمد خان کی غیر سیاسی روش کے خلاف تھے، انکی قائم کردہ سیاسی تنظیم "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" نے بھی مسلمانوں کی سیاسی راہنمائی کی۔[66]

ابتداً سید احمد خان مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے حق میں نہ تھے۔ انکا خیال تھا کہ پہلے مسلمان تعلیم حاصل کریں پھر میدان سیاست میں آئیں۔ خود انہوں نے "آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" (1886ء) کے پلیٹ فارم سے تمام قومی معاملات میں اظہار خیال کیا۔[67] مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ، ہندی کے خلاف اردو کے دفاع کی کوششیں کیں اور کانگریس کے متعصبانہ وہندوانہ کردار پر کڑی تنقید کی۔ انہوں نے طریق انتخاب کے ذریعے قائم ہونے والی برطانوی طرز کی پارلیمنٹ کے مسلمانوں پر اثرات، انکاسدباب، طریقۂ انتخاب کا مسئلہ، غرضیکہ ہر قومی وسیاسی معاملے میں قوم کی رہنمائی کی۔ بوقت ضرورت "اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن" جیسی تنظیمیں بھی قائم کیں۔[68] محسن الملک نے بمقام کلکتہ 1901ء میں "محمڈن پولیٹکل آرگنائزیشن" قائم کی تھی۔[69] لیکن ملکی حالات اب اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ یہ تنظیمیں ناکافی تھیں۔ مسلمانوں کو سیاسی میدان میں اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے ایک موثر سیاسی جماعت کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ بقول سید حسن ریاض

> "مسلمان دیکھ رہے تھے کہ وہ لاکھ سیاست سے الگ رہے۔ مگر سیاست نے انکا پیچھا نہ چھوڑا۔ ملک کی ہر تحریک اور حکومت کا ہر اقدام ان پر اسی طرح اثرانداز ہوتا ہے۔ جسطرح زمین کی چیزوں پر بارش، دھوپ اور ہوا، مگر مسلمانوں کے حق میں ضرر کے ساتھ۔"[70]

تقسیم بنگال کو تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ انگلستان کی قدامت پسند پارٹی کو انتخابات میں شکست ہوئی اور لبرل پارٹی برسراقتدار آگئی۔ لارڈ مارلے (1838ء - 1923ء) جو ایک آزاد خیال اور فراخ دل سیاستدان تھے، وزیر ہند مقرر ہوئے۔ لبرل پارٹی کے برسراقتدار آنے کے بعد انہوں تقسیم بنگال سے پیدا شدہ شورش کو شدت سے محسوس کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ ہندوستان کو کچھ مراعات دے دی جائیں تاکہ ملکی حالات بہتر ہوں۔ تقسیم بنگال کے خلاف کانگریس کا بے جا احتجاج اور حکومت کا یہ اعلان کہ وہ ہندوستان میں نئی اصلاحات کے نفاذ کی ضرورت پر غور کر رہی ہے، سنکر نواب محسن الملک سمیت دیگر رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے حقوق ومفادات کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے۔ آخر غور وخوض کے بعد مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد تشکیل دیا گیا۔ جو تقریباً 35 ارکان پر مشتمل تھا۔ جسکے تمام ارکین غیر سرکاری تھے محمد علی اس وفد میں شامل نہیں تھے کیوں کہ وہ ریاستی اور سرکاری ملازم تھے۔ یہ وفد سر آغا خان (1877ء - 1973ء) کی سربراہی میں یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ کے مقام پر وائسرائے لارڈ منٹو سے ملا اور اپنے مطالبات پیش کئے۔[71] جن میں متناسب نمائندگی کے اصول پر طریقہ انتخاب، مسلمانوں کی تاریخی وسیاسی اہمیت، سرکاری گزیٹڈ و نان گزیٹڈ ملازمتوں میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کا تقرر، ملک کی اعلیٰ وکلیدی آسامیوں میں مسلمانوں کا حصہ، ہائی کورٹ وچیف کورٹ کے جج اور ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی حیثیت سے مسلمانوں کا تقرر، مسلم یونیورسٹی کے قیام کیلئے امداد کا مطالبہ، اور مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی تشخص کی بقاء و تحفظ کے مطالبات شامل تھے۔[72]

اگرچہ وائسرائے نے کوئی حتمی جواب تو نہ دیا لیکن وفد کے مطالبات اور مؤقف سے اصولی اتفاق ضرور کیا۔

وائسرائے نے میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ وغیرہ کے انتخاب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"جیسا کہ میں سمجھتا ہوں یہ دعویٰ آپکے سپاس نامے کا ماحصل ہے کہ الیکشن کے ہر طرز عمل میں خواہ اسکا اثر میونسپل بورڈ پر ہو، ڈسٹرکٹ بورڈ ہو یا مجلس قانون ساز پر، جس میں بھی انتخابی نظام داخل کرنے کی تجویز ہو، یا اس میں کسی اضافے کی۔ اس میں مسلمانوں کی شرکت ایک الیکشن پارٹی کی حیثیت سے ہونی چاہیے۔ میں اس میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔"[73]

لارڈ منٹو کے یہ الفاظ کہ انتخابی کاروائیوں میں مسلمانوں کی شرکت محض انفرادی نوعیت کی نہیں بلکہ جماعتی نوعیت کی ہونی چاہئے، ایک معنی خیز بات تھی۔ انکی اس بات سے بھی مسلمانوں کو فوری ایک سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

محمد علی ریاستی ملازمت و مصروفیات کے باوجود نا صرف ملکی امور سیاست اور حالات وواقعات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بلکہ اکثر سیاسی قائدین کے ساتھ انکا رابطہ رہتا تھا۔ شملہ وفد کی ترتیب وتیاری اور وائسرائے سے ملاقات کیلئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا محمد علی اس سے ناخوش تھے۔ انہوں نے اسے "تعمیل حکم" قرار دیا تھا۔ لیکن وفد نے جو مطالبات پیش کئے ان سے متفق تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی متحرک ہوں اور حقوق کی طلبی وتحفظ کیلئے میدان عمل میں آئیں۔ گو اس وقت تو محمد علی نے شملہ وفد کے بارے میں کوئی تحریری بیان وغیرہ نہ دیا۔ لیکن بعد میں انہوں نے اپنی تحریروں میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"چنانچہ اکتوبر 1906ء میں مسلمانوں کا مشہور وفد شملہ کی چوٹیوں پر بلایا گیا۔ گو القاء حکومت کی طرف سے ہوا تھا۔ لیکن اب مسلمان خود بھی اتنی تعلیم پا چکے تھے کہ حقوق طلب کر سکیں۔ اور انہوں نے جن حقوق کا مطالبہ کیا وہ یقیناً انکا حق تھا۔"[74]

محمد علی نے واضح کیا کہ مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ، مسلمانوں اور ہندوؤں کے اندر پیدا شدہ تفریق کو دیکھنے کے بعد کیا۔ جس سے مسلمانوں میں سیاسی احساس اور حقوق کے تحفظ کا شعور پیدا ہوا۔ محمد علی جو مخلوط انتخاب اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست موید تھے۔ آخر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ :۔

"--- خیر الہام یا القاء جہاں سے بھی ہوا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس مرتبہ مسلمانوں کا دعویٰ حق طلبی خوب زور سے پیش ہوا۔ مشترکہ حلقہ جات انتخاب میں بلاشبہ مسلمانوں کو کافی اور حقیقی نمائندگی حاصل نہ ہو سکتی تھی اور ان حضرات کو جنہوں نے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے قیام پر، جسکے مسلمان خواہش مند تھے، افسوس اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ حق انتخاب جداگانہ مسلمانوں اور انکے کثیر التعداد ہندو بھائیوں میں جدائی کا سبب نہیں، بلکہ پہلے سے جو جدائی موجود تھی، اور آج بھی موجود ہے اور ملک کے ہر گوشے میں نمایاں ہے اسکا لازمی نتیجہ تھا۔ مسلمانوں نے مفاد ملی کے خیال سے غیر مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا شملہ جا کر مطالبہ کیا۔ اور سیاسی احساس کے پیدا ہو جانے کے بعد اپنے تحفظ کیلئے مسلم لیگ کی دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں بنیاد ڈالی۔"[75]

جہاں تک محمد علی کا شملہ وفد کی ترتیب و تیاری کے بارے میں اعتراض کا تعلق ہے وہ ہندو پروپیگنڈہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔[76] کیونکہ تقسیم بنگال کے بعد مسلمانوں کا علیحدہ قومیت کے طور پر تسلیم کیا جانا اور پھر انکے حقوق کے تحفظ کا وعدہ، کانگریس، ہندوؤں اور خصوصاً ہندو پریس کیلئے سخت پریشان کن تھا۔ اسلئے جہاں انہوں نے مسلمانوں کو نفرت و مخالفت کا نشانہ بنایا وہاں ہندو اخبارات نے وفد کی ترتیب و تیاری کو انگریز حکام کا کارنامہ قرار دیا کہ شملہ وفد انکی ہدایت اور خواہش کا ضامن ہے۔ حالانکہ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہندوؤں نے اپنے ان الزامات و اعتراضات کی بنیاد علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچبولڈ کے اس خط پر رکھی جو اس نے 10 اگست 1906ء کو نواب محسن الملک کو لکھا تھا کہ وائسرائے لارڈ منٹو ایک مسلم وفد کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ اس میں ارچبولڈ نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنی طرف سے چند تجاویز ضرور پیش کی تھیں اور ساتھ ہی یادداشت ڈرافٹ کرنے کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ حالانکہ وفد کی ترتیب کا منصوبہ نیا نہ تھا۔ 1903ء میں دربار دہلی کے موقع پر بھی نواب محسن الملک نے اسطرح کا ایک وفد ترتیب دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی تحریک نواب محمد اسمٰعیل کی طرف سے ہوئی۔ جنھوں نے ایک خط کے ذریعے نئی اصلاحات کے حوالے سے نواب محسن الملک کو بروقت اقدام کرنے کی ترغیب دی تھی۔ ترتیبِ وفد کی تجویز 4 اگست 1906ء کو ایک خط کے ذریعے محسن الملک نے پیش کی نہ کہ 10 اگست 1906ء کو آرچ بولڈ نے۔ آرچ بولڈ نے جو خط 9 اگست 1906ء کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری ڈینلپ سمتھ کو لکھا۔ وہ نواب محسن الملک کے خط کے حوالے ہی سے لکھا تھا۔[77] حالانکہ مختلف واقعات کی رفتار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ہندی تنازعہ کے بعد جو حالت پیش آئے اور جس طرح قوم میں سیاسی شعور بیدار ہوا۔ اس سے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو قومی ترقی کا احساس اور سیاسی جمود توڑنے کا خیال آیا۔ شملہ وفد اسی کا نتیجہ تھا۔

لیفٹیننٹ گورنر مشرقی بنگال مسٹر فلر کے استعفیٰ کی وجہ سے مسلمانوں میں پیدا ہونے والے غم و غصہ پر قابو پانے کیلئے مسلم وفد کا استقبال کرنا حکومتِ وقت کی مجبوری تھی۔ اسی وجہ سے وزیر امورِ ہند مسٹر مارلے نے اسے برصغیر میں پائی جانے والی مختلف نسلوں اور مذاہب کے درمیان حکومت کی غیر جانبداری کے اظہار کا بہترین موقع قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر رضی واسطی نے لکھا ہے کہ اس وقت مسٹر منٹو تو کانگریس کے وفد سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ لیکن کانگریس نے اپنے منفی طرز عمل کی وجہ سے ایسا نہ کیا۔[78] اس سے ہندوؤں کے پروپیگنڈے کی قلعی مزید کھل جاتی ہے۔ مسٹر ارچبولڈ کی تو کوشش تھی کہ مسلمان انتخاب کی بجائے نامزدگی کا مطالبہ کریں اور آئندہ کیلئے سیاست سے کنارہ کشی کی یقین دہانی کرائیں۔ لیکن محسن الملک اور دوسرے مسلم قائدین نے انکی باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور ان کے ڈرافٹ تیار کرنے کی پیش کش کو بھی قبول نہ کیا۔[79]

شملہ وفد کو جن شرائط پر ملاقات کی اجازت ملی تھی۔ ان میں ایک شرط یہ تھی کہ مسلمانوں کا وفد جو یادداشت پیش کرنا چاہتا ہے۔ اسکی ایک نقل پیشگی وائسرائے کو بھجوائی جائے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کا خصوصی اجلاس ستمبر 1906ء میں ہوا۔ آخر یادداشت تیار کرنے کی ذمہ داری محسن الملک کو قبول کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں انہوں نے دیگر رہنماؤں مثلاً پٹنہ کے سر علی امام (1869ء - 1932ء) رامپور کے جسٹس شاہ دین اور حیدرآباد کے نواب عماد الملک سے

تعاون حاصل کیا۔ متفقہ فیصلے کے بعد نواب عماد الملک نے وفد کی یادداشت کا مسودہ تیار کیا۔ نواب محسن الملک ہمہ وقت انکے ساتھ رہے۔ وہ ایک ایک نکتے اور جملے پر غور و فکر کرتے رہے۔ جب بر عظیم کے دو کہنہ مشق اور بالغ نظر رہنماؤں نے یہ یادداشت تیار کر لی۔ تو 16 ستمبر 1906ء کے اجلاس لکھنو میں ایک بار پھر اس کی جانچ پر کھ کی گئی۔ ان حالات میں یہ پروپیگنڈہ بے بنیاد ہے کہ شملہ وفد حکومت وقت کے اشارے پر تیار کیا گیا۔[80]

مسٹر بٹلر (Butler) نے جو اس زمانے میں لکھنو کے ڈپٹی کمشنر تھے، انہوں نے بھی مسلمانوں کی یادداشت میں آرچبولڈ کی طرح اپنی بات منوانے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے انگریزی ہدایات پر عمل کی بجائے صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر اپنے حقیقی جذبات کو حکومتِ وقت تک پہنچایا۔ ہندو پریس نے نواب محسن الملک اور شملہ وفد کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنی اغراض کے لیے استعمال کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بلکہ مسلمانوں نے شملہ وفد کو صحیح ترجمانی اور واضح کامیابی کا ذریعہ قرار دیا۔ آخر کار حالات وواقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد محمد علی نے بھی شملہ وفد کی اہمیت اور کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ :۔

> "اس ڈپوٹیشن کو باریابی ہی نہیں، بلکہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اور اسکے بعد مسلمانوں نے اسکی ضرورت محسوس کی کہ اسی صوبے میں جاکر جس میں انکی اکثریت تقسیم بنگال کے باعث ہو گئی تھی اور جہاں مسلمان ہنود کے ساتھ جنگ کی کشمکش کے باعث پریشان تھے۔ ایک سیاسی جمعیت ملیہ قائم کریں۔ تاکہ آئندہ اصلاحات میں انکے حقوق کا پاس رکھا جائے اور جو حقوق انکو ملیں، انکا وہ صحیح استعمال کر سکیں۔ اس سیاسی جمعیت ملیہ کا نام ڈھاکہ کی ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد مسلم لیگ رکھا گیا اور اسکی بناء پر اسکے قانون اساسی کی تیاری میں نواب وقار الملک مرحوم، مسٹر مظہر الحق، سید وزیر حسین اور سید ظہور احمد لکھنوی کے ساتھ میرا بھی معتد بہ حصہ تھا۔"[81]

محمد علی اور علی گڑھ کالج

مسلمانوں کے حقوق و مفادات اور مطالبات خواہ سیاسی ہوں یا تعلیمی، معاشی ہوں یا سماجی، محمد علی کسی طور ان سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اگرچہ بڑودہ کی ملازمت کے دوران محمد علی مسلمانوں کے اہم قومی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے۔ لیکن انکی توجہ اور سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز و محور انکا اپنا کالج علی گڑھ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی دو مستقل گروپوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروپ کی قیادت صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور دوسرے کی قیادت شوکت علی اور محمد علی کر رہے تھے۔ نواب محسن الملک ان دونوں گروپوں کے درمیان حد فاصل بنے ہوئے تھے۔ جس سے بعض اوقات دونوں کو شکایت ہوتی تھی۔ نئی پود (جن کے قائد شوکت علی و محمد علی تھے) شاکی تھی کہ مقامی ٹرسٹیانِ علی گڑھ دوسروں کو آگے آنے کا موقع نہیں دیتے اور صرف اپنے دوست واحباب کو نوازتے ہیں۔ اس اندرونی کشمکش نے جذبات کی رو مخالف

سمت کی طرف موڑ دی۔ اور رفتہ رفتہ نئی پود بنگالیوں کی انقلابی تحریک سے بھی متاثر ہوتی گئی۔[82] جسکا رخ انگریز اساتذہ اور پرنسپل کے خلاف موڑ گیا۔ کیونکہ اس وقت تک طلباء میں یہ خیال پختہ ہو گیا تھا کہ انگریز اساتذہ اپنی حیثیت کے درست استعمال کی جائے حکومتی ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اور طلبہ کی آزادی فکر و خیال پر بے جا قیود عائد کرتے ہیں۔ محمد علی بھی ان کے ہم خیال تھے۔

مسٹر بیک اور مسٹر ماریسن کی طرح نئے پرنسپل مسٹر ارچبولڈ بھی کالج کے علاوہ ملکی سیاسی فضا پر چھائے ہوئے تھے اور من پسند پالیسیاں بناتے تھے۔ جو جی میں آتا کرتے تھے۔ محمد علی کو بھی جب موقع ملتا انہیں نشانہ تنقید بنائے بغیر نہ رہتے تھے۔ نواب محسن الملک انگریز پرنسپل اور پروفیسروں کو قابو میں نہ رکھ سکے تھے۔ وہ قابو میں رکھ بھی کیسے سکتے تھے اصل اختیارات کا منبع و سرچشمہ تو انگریز خود تھے۔ بلکہ کبھی کبھار انگریز پرنسپل کا رویہ نواب محسن الملک کے ساتھ ناشائستہ اور زیادتی پر مبنی بھی ہوتا تھا۔ محمد علی کو یہ چیز شاق گزرتی تھی کہ محسن الملک ان چیزوں کے خلاف رد عمل ظاہر کیوں نہیں کرتے۔ محسن الملک کی خاموشی کے بارے میں اخبار "البشیر" لکھتا ہے کہ :۔

> "----وہ (ٹرسٹی) اس پرنسپل کی خود مختار کاروائیوں کو نواب محسن الملک کی بزدلی پر محمول کرتے تھے۔ نواب محسن الملک ایک طرف ٹرسٹیوں کی دھمکیاں سنتے تھے اور دوسری طرف پرنسپل کی نامناسب کاروائیوں سے دلبرداشتہ رہتے تھے۔ انہیں جو فکر تھی وہ یہ تھی کہ کالج کی شہرت اور نیک نامی روزافزوں ترقی پکڑے اور اس کی مالی حالات کسی نہ کسی طرح اچھی ہو جائے۔ اور کسی نہ کسی طرح کالج کی تعداد طلباء میں اضافہ ہو، اور کالج مسلمانوں میں مرکزی حیثیت حاصل کرے۔"[83]

وہ کالج کی بہتری کے لیے مصلحتاً خاموش رہتے لیکن محمد علی اور ان کے ساتھی اس خاموشی کو کمزوری سے تعبیر کرتے تھے۔ کیونکہ محمد علی خود کمزوری اور مصلحت پسندی کے خلاف تھے۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کی رورعایت کے قائل نہ تھے۔ خواہ مدمقابل بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔ جسکا برملا اظہار انہوں نے اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ 26 نومبر 1906ء کو نواب محسن الملک کے نام خط میں علی گڑھ کالج سے متعلق تمام حالات و واقعات کا ذکر کرتے ہوئے انکے منفی نتائج سے آگاہ کیا۔[84]

علی گڑھ کالج کے پرنسپل اور انگریز سٹاف نے لامحدود اختیارات اور بے جا مراعات کی وجہ سے جو بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ محمد علی اس سے سخت نالاں تھے۔ ایک حد تک وہ خود بھی انکے زخم خوردہ تھے۔ مسٹر ارچبولڈ اپنی حاکمیت کے جلال اور اقتدار کے نشے میں نواب محسن الملک کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ارچبولڈ کی فرعونیت کا منہ بولتا ثبوت 1905ء کا دلخراش واقعہ ہے۔ جب طلباء نے بورڈنگ ہاؤس کے انتظامات سے متعلق چند شکائیتوں کا میموریل سینئر طالب علم سید مصطفیٰ حسین رضوی کے ذریعے پرنسپل کے سامنے پیش کیا۔ جسکا براہ راست اثر (مسٹر گاڈزبردون) پر دودست پر پڑتا تھا۔ دوسری طرف صورتحال یہ تھی کہ مسٹر ارچبولڈ ممبران سٹاف کے زیر اثر آچکے تھے۔ مسٹر گاڈزبردون کے حامیوں نے

پرنسپل کو اپنے حق میں رام کر لیا۔ لہذا ارچبولڈ نے طلباء کے اس میموریل کو ڈسپلن کے خلاف قرار دے کر بلا تحقیق سید مصطفیٰ حسین زیدی کو بورڈنگ چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ محسن الملک قومی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے طلباء پر خصوصیت سے شفیق تھے۔ انکی یک گونہ تربیت کرتے تھے اور ان سے زیادہ تر کانفرنس کے کام لیتے تھے۔ سید مصطفیٰ حسین بھی اسکی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس جبری اخراج کے بعد کمیٹی کے ایک جلسہ منعقدہ 29 اکتوبر 1905ء میں وہ حسب ضابطہ شریک ہوئے۔[85] لیکن مسٹر ارچبولڈ ان سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے کہا۔

"میں یا مصطفیٰ حسین دونوں میں سے کسی ایک کو میٹنگ سے چلے جانا چاہیے۔"[86]

ناچار مصطفیٰ حسین رضوی کو میٹنگ سے باہر جانا پڑا۔ اب یہ معاملہ قومی توہین کا ایک سوال بن گیا۔ محمد علی جو تمام صورتحال سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اس واقعہ کے حوالے سے محسن الملک کو انکی خاموشی اور مصلحت پسندی پر سخت خطوط لکھے اور جذبات کی رو میں بہہ کر حفظِ مراتب کو بھی فراموش کر دیا۔ محمد علی کا کہنا تھا کہ قانون و قاعدہ کی رو سے سب برابر ہیں سب پر اس کا اطلاق یکساں ہونا چاہیے۔ اگر ایک ہندوستانی کو اس کی غلطی پر (خواہ وہ نادانستہ ہی کیوں نہ ہو) سزا دی جاسکتی ہے۔ تو انگریز کو کیوں نہیں؟ یہ بنیادی انسانی حقوق کے سلسلے میں امتیاز و تقسیم چہ معنی دارد۔ محمد علی کا استدلال تھا کہ مسٹر ارچبولڈ کے رویہ سے نہ صرف سید مصطفیٰ حسین بلکہ بحیثیت سیکریڑی نواب محسن الملک کی بھی سخت توہین ہوئی ہے۔ لہذا ارچبولڈ ان سے علی الاعلان معافی مانگیں۔ نواب صاحب اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ ارچبولڈ کیلئے ایسا کرنا ناممکنات میں سے ہے اسلئے مصلحتاً خاموش رہے۔ محمد علی جو جھکنے اور خاموش رہنے والے نہ تھے، انکا طرز عمل اس کے برعکس تھا۔ انہوں نے نواب محسن الملک کے نام خط میں اس نازیبا واقعہ کے بارے میں تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے :۔

"ایک شریف مسلمان، فدائے قوم اور اس قوم کی ذلت ہوئی ہے۔ اس شرمناک غلطی پر مسٹر ارچبولڈ کو معافی مانگنی چاہیے اور اگر وہ معافی مانگنے پر رضامند نہیں تو صرف یہ ممکن ہے کے ٹرسٹیانِ کالج انکو خیر باد کہیں۔"[87]

اس واقعہ نے قومی درد رکھنے والے محمد علی کے اندر اضطرابی کیفیت پیدا کر دی۔ لہذا اسی سلسلے میں دوبار محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"اگر اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ مسلمانوں کے لیڈر نہ ہونگے۔ بلکہ ہر بے ریٹائر چپن پروفیسر اپنے آپکو اس قوم کا فرعون سمجھے گا۔ نہ یہ مصلحتیں ہونگیں۔ نہ آپ میں وہ طاقت ہوگی۔ ہمیشہ کیلئے کالج آپکے اور ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"[88]

محمد علی جو اس واقعہ پر شدید کرب کا شکار تھے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے 10 دسمبر 1906ء کو دوبارہ نواب محسن کو ایک طویل خط تحریر کیا کہ :۔

"----اگر میں دیکھوں کہ میرا بھائی شوکت کوئی ایسا کام کرتا ہے جو میری قوم کیلئے مضر ہے۔ میرے ملک کے لئے نقصان کا باعث ہے۔ یا میرے ہم وطنوں کیلئے تباہ کن ہے۔ تو واللہ باللہ مجھے اس میں دریغ نہ ہوگا کہ دو چھریاں تیز کروں اور

ایک ایک گلے پر دن کو یا رات کو چھپے، چوری یا اعلانیہ، زبردستی یا دھوکے سے
پھیر دوں اور پھر بہ تقاضائے محبت دوسری اپنے گلے پر پھیر دوں۔ جو حرکت نابینا
سمسن (Samoson) نے فلسطنیوں (Phillistins) کے ساتھ کی تھی۔
اپنے اوپر اور ساری قوم پر ایک عظیم الشان عمارت کو ڈھادیا تھا۔ اور جس آفت
میں آوروں کو پھنسادیا تھا۔ اسی میں خود پھنس کر مر گیا تھا۔ وہ ہی کام
کرنا غیرت قومی کا تقاضہ ہے۔ اور وہی موت مرنا میری محبت ذاتی کیلئے
موزوں ہے۔"[89]

دراصل یہ وہ دور تھا جب محمد علی کا عالم شباب تھا۔ وہ ہوش کی جائے جوش سے کام لیتے تھے۔ لیکن محسن الملک عمر رسیدہ اور متحمل مزاج بزرگ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلے کا اختیار اور قوت کا سرچشمہ انگریز ہیں، ان حالات میں جوش دکھانے کا مطلب اپنا ہی نقصان کرنا ہے۔ اسلئے وہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے اور مصالحانہ روش اختیار کرتے تھے۔ جو محمد علی کو قطعی ناپسند تھی۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی چند سالوں میں ایسے واقعات پیش آئے۔ جنکا رخ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ آریہ سماج جو ہندو مذہب کے احیاء کے نام پر شروع کی گئی تھی۔ اس نے ہندوؤں کو اسلام کے خلاف برسرپیکار کر دیا۔ اور ہندوستان صرف ہندوستانیوں (ہندوؤں) کیلئے India for Indians ہے، کا نعرہ لگایا۔ مسلمان غیر ملکی ہیں انہیں ملک سے باہر نکال دیا جائے یا زبردستی ہندو بنالیا جائے۔[90] دکن کے سیاستدان بال گنگادھر تلک نے محرم کے جلوس کے مشابہ مسلمانوں کے خلاف "گنپتی" کے میلے کا آغاز کر دیا جس میں مسلمانوں کے خلاف شدید اشتعال پھیلایا جاتا۔ تلک اور اسکا بنگالی ساتھی سریندر ناتھ بنرجی جو ظلم و فریب کی کالی دیوی کے پجاری تھے، کانگریس پر چھا چکے تھے۔[91] انہوں نے ہندو قوم کی سیاست کا رخ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف موڑ دیا تھا۔ متعصب اور انتہاپسند ہندوؤں نے مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے کیلئے "شدھی" تحریک کا آغاز کر دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے "بھارت مہامنڈل" نام کی تنظیم قائم کی گئی۔ جسکا سربراہ مہاراجہ ڈربھنگہ کو بنایا۔[92] ان حالات میں مسلمانوں کیلئے اپنا دفاع ضروری تھا جسکے لیے سیاسی طور پر منظم ہونے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی تحریک، اہل حدیث تحریک، اور تحریک مجاہدین وغیرہ نے اپنا مذہبی و قومی فریضہ ادا کرتے ہوئے جدو جہد جاری رکھی۔ متحدہ قومیت کے تصور کو مسلم عوام کے اندر جڑنہ پکڑنے دیا۔ اور مسلمانوں کیلئے الگ سیاسی جماعت کے قیام کی راہیں ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔[93] مسلمان اقتصادی لحاظ سے تو پہلے ہی پس ماندگی کا شکار تھے۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمان قوم سماجی طور پر بھی ایسے مقام پر آن پہنچی تھی کہ انکو قومی تشخص کے تحفظ وبقاکیلئے اپنے آپکو منظم کرنا ناگزیر ہوگیا۔ مسلمانوں کے ثقافتی ورثے کو ملیامیٹ کرنے کی مذموم کوششیں کی جارہی تھیں۔ ان کی تاریخ کو حقیر گردانا جارہا تھا۔ ادب کی تضحیک ہو رہی تھی۔[94] مسلمانوں کی زبان اردو کی مخالفت میں اردو ہندی تنازعے نے جنم لیا۔ جس نے مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ جسکی سرگرمیوں نے واضح کر دیا کہ ہندوؤں کی اصل دشمنی اردو زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں

سے ہے۔ اردو ہندی تنازعے نے مسلمانوں کو بھی مدافعت کیلئے تیار کر دیا۔ تقسیم بنگال 1905ء کے خلاف ہندوؤں کے شدید رد عمل نے یہ ظاہر کر دیا کہ ہندو مسلمانوں کو انکے جائز حقوق دینے کیلئے بھی تیار نہیں۔ ہندوؤں نے من حیث القوم مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کی جدو جہد تیز کر دی۔[95] مقام افسوس کہ اس منظم جدو جہد کا آغاز کانگریس کے پلیٹ فارم سے کیا گیا۔ جو تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی دعویدار تھی۔ مسلمانوں کیلئے ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ ان میں اپنے حقوق کے تحفظ کیلئے الگ سیاسی پلیٹ فارم کی تشکیل کا احساس روز بروز شدت اختیار کر تا گیا۔[96]

دوسری طرف انگریز حکومت میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کیلئے ایسے افراد کی ضرورت تھی۔ جو مغربی تعلیم سے آراستہ اور یورپین انداز سیاست سے آگاہ ہوں۔ خوش قسمتی سے تحریک علی گڑھ اور اسکے زیر اثر قائم ہونے والے تعلیمی اداروں نے ایسے نوجوان پیدا کر دیے تھے۔ جو اچھے سیاسی کارکن ثابت ہو سکتے تھے، جن میں محمد علی بھی نمایاں تھے۔[97] مزید براں بیسویں صدی کے آغاز میں بین الاقوامی سطح پر چند ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے استعمار پسند قوموں کا رعب ودبدبہ کم ہوگیا۔ اور مغلوب قوموں میں سیاسی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ روس کی جاپان کے ہاتھوں شکست اور مشرق وسطیٰ میں ایران و ترکی کے واقعات بھی مسلمانان ہند کو سیاسی طور پر بیدار کرنے کا موجب بنے۔[98] 1905ء کے انتخابات میں انگلستان کی لبرل پارٹی بر سر اقتدار آگئی۔ جان مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو وائسرائے متقرر ہوئے۔ مسٹر مارلے نے بجٹ پر بحث کے دوران ہندوستان کیلئے نئی دستوری اصلاحات کا وعدہ کیا۔ جس میں انتخاب کے عنصر کو اہمیت دی جانے والی تھی۔ اس اعلان نے مسلمان راہنماؤں کو سیاسی طور متحرک کر دیا۔ نواب محسن الملک نے فوراً مسلمانوں کو دستوری اصلاحات میں انکا حق دلوانے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے شملہ وفد ترتیب دیا اور وائسرائے لارڈ منٹو سے کامیاب ملاقات کی۔[99] وفد کی کامیابی کے ساتھ ہی مسلم قائدین نے مستقل سیاسی جماعت بن کر اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان حالات و واقعات نے محمد علی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ آزادانہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ انہوں نے حاکم بڑودہ سے اجازت چاہی کہ انہیں سیاسی سرگرمیوں اور صحافت میں حصہ لینے کی اجازت دی جائے۔ اگرچہ حاکم بڑودہ نے اجازت دے دی۔ لیکن دیسی ریاست کے ملازم کی حیثیت سے یہ سب کچھ آزادانہ طور پر ممکن نہ تھا۔ تاہم آغازِ کار محمد علی نے ملازمت کے ساتھ ساتھ سیاسی امور میں شرکت کی۔ جسکی واضح مثال دسمبر 1906ء ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے سلسلے میں منعقدہ اجلاس میں شرکت اور خدمات کی انجام دہی ہے۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ایک ماتحت کی حیثیت سے صحیح معنوں میں سیاسی امور کی بجاآوری کافی مشکل ہے۔ چنانچہ 1907ء میں انہوں نے پہلے چند ماہ کی رخصت لی اور اسکے بعد طویل رخصت لیکر خود کو غلامی کی اس علامت (ملازمت) سے آزاد کر لیا۔[100]

انڈین نیشنل کانگریس، تقسیم بنگال، شملہ وفد اور دیگر سیاسی و نیم سیاسی تنظیموں نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ خصوصاً یہ احساس اس جماعت کی طرف سے پیدا ہوا جو سید احمد خان کی جانشین تھی اور سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اس سے ہر وقت بے تعلقی کا اظہار کرتے رہنا ملکی خدمت و قومی وفاداری گردانتی تھی۔ دراصل ایسا کرنا اس وقت کی ضرورت اور مسلمانوں کی مجبوری تھی 1906ء بمقام ڈھاکہ ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی تو وہیں مسلمانوں کی آئندہ سیاسی زندگی کی تشکیل کے طور پر ایک سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ وجود میں

آئی۔[101] محمد علی جو سیاست میں بھرپور انداز میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ انہوں نے بھی اس کے ابتدائی تشکیلی اجلاس میں نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ محمد علی نے ال انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ :۔

"ہاں مجھے معلوم ہے کہ آپکی مسلم لیگ کی شروعات جون 1906ء میں ہوئیں۔
ہمیں یہ نام پسند آیا اور ہم نے اسکو اپنالیا۔"[102]

محمد علی نے اگرچہ اس وقت تک عملی طور پر سیاسی میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اور نہ ہی بطور سیاسی قائد ان سے کسی قسم کی توقعات وابستہ تھیں۔ پھر بھی محمد علی نے مسلم لیگ کی تاسیس اور استحکام میں نمایاں حصہ لیا۔ لیگ کے قواعد و ضوابط کی ترتیب و درستگی کا کام کیا۔ بعد ازاں 1907ء میں تمام کاروائی کو "The Green Book" نامی کتابچہ کی صورت میں شائع کیا۔ بقول سر محمد یعقوب علی (1879ء -1942)

"---- مسلم لیگ کی ساخت اور اسکے قواعد کی ترتیب میں محمد علی کا بڑا حصہ تھا۔ اور
اس وقت سے محمد علی کی زندگی سراپا سیاست بن گئی۔"[103]

حوالہ جات

1 - احمد علی خان شوق : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص ص.85-484

II - محمد صادق قصوری : تحریک پاکستان اور علماء کرام۔ (لاہور-1999ء) ص.54

نوٹ :۔ محمد علی کے آباؤ اجداد اور خاندان سے متعلق مکمل تفصیل درج ذیل کتب میں موجود ہے۔

I - آل حسن مودودی : نخبتہ التواریخ ۔ (امروہہ-1297ھ) ص ص.13-112

II - محمود احمد عباسی : تحقیق الانساب۔ (دہلی-1932ء) ص ص.55-351

III - محمود احمد عباسی : تاریخ امروہہ۔ جلد اول۔ (دہلی-1932ء) ص ص.69-65

IV - احمد علی خان شوق : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص.459

V - محمود احمد عباسی : تذکرۃ الکرام۔ (دہلی-1930ء) ص ص.85-70

2 - ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر : ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ حصہ اول۔ (مترجم: صادق حسین) (لاہور-1955ء) ص ص.18-216

II - P. Hardy : ***The Muslims of British India.*** (Cambridge-1972) P-59

III - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (مترجم: ہلال احمد زبیری) (کراچی-1967ء) ص.347

IV - حمیدہ ریاض : محمدعلی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص.39

3 - محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص ص.32-31

(بحوالہ ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر : ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ (لاہور-1955ء)

4 - ایضاً ص.59

5 - ڈبلیو. ڈبلیو. ہنٹر : بحوالہ سابقہ۔ ص.172

6 - الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید۔ (لاہور-1966ء) ص.145

II - محمد امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.5

III - Safder Mahmood/ Javeed Zafar : ***Founders of Pakistan.*** (Lahore-1968) P-9

IV - Keth Kalnád : ***A Pakistan Political Study.*** (London-1957) P-12

7 - محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص.60

8 - ایضاً . . . .

9 - فرمان فتحپوری : ہندی اردو تنازعہ۔ (اسلام آباد-1977ء) ص.8

Richard Temple : ***India in 1880.*** (London-1980) P.115 - II

W.W Hunter : ***Our Indian Muslims.*** (London-1971) PP104-10 - III

10 - محمد سلیم احمد : بحوالہ سابقہ۔ ص.38

11 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.ی

12 - سید مصطفیٰ علی بریلوی : انگریزوں کی لسانی پالیسی۔ (کراچی-1970ء) ص ص.81-79

C.H.Philips : ***The Evolution of India and Pakistan, 1858-1947.*** - II

(London-1962) PP.178-80

P. Hardy : ***Op. cit.,*** P-75-77 - III

13 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.57

(حوالہ : کرسٹائن ڈوبن : بیسک ڈاکو منٹس۔ (لندن-1970ء) ص.18)

14 - خورشید علی مہر : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1931ء) ص.12

II- روزنامہ : مشرق۔ کراچی۔ 18دسمبر1978ء (مولانا عبدالقدوس ہاشمی۔ مولانا محمد علی بے مثل رہنما۔ ص.7)

15 - احمد علی خان شوق : تاریخ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص.460

II - محمود احمد عباسی : تاریخ امروہہ۔ جلد اوّل (دہلی-1932ء) ص ص.71-69

16 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.28

II- روزنامہ : مشرق۔ لاہور۔ 27دسمبر1978ء (ہدایت اللہ خان۔ محمد علی جوہر کانفرنس ص.9)

17 - آل حسن مودودی : نخبتہ التواریخ۔ (امروہہ-1297ھ) ص ص.17-115

II - احمد علی خان شوق : تذکرہ کاملان رامپور۔ (دہلی-1929ء) ص ص.38-537

III - ابو سلمان شاہجہانپوری : مکتوبات رئیس الاحرار مولانا محمدعلی جوہر،سیا سی۔ (کراچی-1978ء) ص.201

IV - حمیدہ ریاض : محمدعلی جوہر۔ (ناگپور-1988ء) ص.39

18 - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص ص.28-27

Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment.*** (Lahore-1942) P-5 - II

Afzal Iqbal : ***Life and times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) P-22 - 19

Ibid., ... P-35 - 20

II - رامپور اسٹیٹ گزٹ۔ 22ستمبر1890ء

21 - ایضاً . . . .

II- روزنامہ : مشرق۔ کراچی 16دسمبر1978ء(خالد لطیف۔ تحریک آزادی کے عظیم رہنما ص.3)

22 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.9

II- ہفت روزہ : مشرق میگزین۔ لاہور۔ 9 جنوری 1987ء (علامہ شبیر بخاری۔ مولانا محمد علی ص ص.27-21)

III- ، ، : ، ، ، کراچی 8 جنوری 1988ء (عشرت رحمانی۔ مولانا محمد علی جوہر ص ص.45-42)

23 - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.41

II - نسیم سوہدروی : علی گڑھ کے تین نامور فرزند۔ (لاہور-1976ء) ص.9

24 - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.42

II - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.12

III - عبدالوحید خان : مسلمانوں کا ایثار اور جنگ آزادی۔ (لکھنو-1938ء) ص ص.92-90

25 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.14

II - رئیس احمد جعفری : کاروان گم گشتہ۔ (کراچی-1971ء) ص ص.21-20

26 - راجہ موہن داس : مسلم افکار۔ (مترجم: محمد فاروق قریشی) (لاہور-1996ء) ص.143

II - ولی مظہر : عظمتوں کے چراغ۔ جلد دوم (ملتان-1988ء) ص.383

III - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص ص.14-13

IV - G-Allana: ***Our freedom Fighters 1562-1947.*** (Lahore-1985) P.271

27 - حمیدہ ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.42

II - عبداللطیف اعظمی : مولانا محمد علی، ایک مطالعہ۔ (دہلی-1980ء) ص.18

28 - Francis Robinson : ***Separatism Among Indian Muslims, the Politics of the United Provinces.*** (London-1974) P-361

II - مفتی انتظام اللہ شہابی : مشاہیر جنگ آزادی۔ (کراچی-1957ء) ص.285

III - عزیز الرحمٰن جامعی : جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین۔ حصہ سوم۔ (دہلی-1975ء) ص ص.70-169

29 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.16

30 - سید مسعود حسن لکھیم پوری : عندلیب تواریخ۔ (الہ آباد-1963ء) ص.53

II - Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) P-37

31 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.21

II - محمد سرور : محمد علی کے یورپ کے سفر۔ (لاہور-1941) ص.17

III - عشرت رحمانی : حیات جوہر۔ (لاہور-1985ء) ص.29

32 - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (دہلی-1963ء) ص.82

II - ثناالحق صدیقی : محمدعلی جوہر ،حیات اور تعلیمی نظریات۔ (کراچی-1998ء) ص.48

III - Afzal Iqbal : *Life and Times of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P-31

33 - Ibid., ...PP-31.33

میاں فضل حسین کی "غیر مطبوعہ ڈائری" جو جامعہ ملیہ دہلی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں محمد علی کی قیام لندن کے دوران ادبی و سماجی سرگرمیوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

II - Afzal Iqbal : (Ed) *My Life : A Fragment* (Lahore-1942) P-15

34 - محمد سرور : مولانا محمدعلی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.86-88

II- روزنامہ : مشرق۔ کراچی۔ 4جنوری1980ء (فرحت شاہجہانپوری۔ مولانا محمد علی ص.5)

35 - راجہ موہن داس : بحوالہ سابقہ۔ ص.144

II- روزنامہ : حریت۔ کراچی 6جنوری1975ء (اعجازالحق قدوسی۔ مولانا محمد علی جوہر ص.3)

36 - Afzal Iqbal : *Life and Times of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P-33

II - ماہنامہ : الجامعہ۔ مولانا محمد علی جوہر نمبر۔ جلداول۔ دہلی۔ اپریل-1979ء

III - مجلّہ : برگ گل۔ جوہر نمبر۔ گورنمنٹ اردو کالج کراچی۔ 1401ھ

IV- روزنامہ : حریت۔ کراچی۔ 4جنوری1975ء (ڈاکٹر محمد شمس الدین۔ مولانا محمد علی جوہر ص.5)

37 - رئیس احمد جعفری : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1932ء) ص.19

II - منشی عبدالرحمٰن : معماران پاکستان۔ (لاہور-1976ء) ص.237

III - عبدالماجد دریابادی : خطوط مشاہیر۔ (لاہور-1944) ص.253

IV- روزنامہ : حریت۔ کراچی۔ 15دسمبر1978ء (خالد لطیف۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ص.3)

38 - خورشید علی مہر : سیرت محمدعلی۔ (دہلی-1931ء) ص.15

II - Afzal Iqbal : (Ed) *My Life : A Fragment.* (Lahore-1942) P-15

III - Afzal Iqbal : *Life and Time of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P-34

IV- روزنامہ : نوائے وقت۔ لاہور 14 مئی1977ء (ڈاکٹر زاہد علی واسطی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ص.5)

39 - عاشق حسین بٹالوی : ہماری قومی جدوجہد۔ (لاہور-1966ء) ص ص.52-248

II - F.K.Durani : *The Meaning of Pakistan.* (Lahore-1966) P-56

III - Peter Hardy : *Op. cit.,* P-131

برہمو سماج : برہمو سماج کا آغاز 1828ء میں ایک ہندو راجہ موہن رائے نے کیا۔ راجہ رام 1772ء میں رادھا نگر میں پیدا ہوا۔ عربی و فارسی زبان پر مہارت کی وجہ سے "مولوی رام موہن رائے" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

پرارتھنا سماج: یہ تحریک انیسویں صدی کے وسط میں بمبئی مہاراشٹر میں شروع ہوئی۔ اسکا بانی ڈاکٹر آتمارام پانڈورنگ ہندو تھا۔

دیوسماج: دیو سماج کی بنیاد 1887ء میں ستیانند اگنی ہوتری نے لاہور کے مقام پر رکھی۔ یہ تحریک مادی ترقی پر زور دیتی تھی۔

آریہ سماج: دیانند سرسوتی نے 1875ء میں بمبئی کے مقام پر اسکی بنیاد رکھی۔ دیانند سرسوتی گجرات کاٹھیاوار کے برہمن خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "ستھیار تھ پرکاش" 1874ء میں مکمل کی۔ اس کتاب کا چودھواں باب اسلام کی مخالفت میں لکھا گیا ہے۔

گئو رکھشا سبھا: آریہ سماج نے گئو رکھشا سبھا بھی قائم کی۔

40 - سید حسن ریاض : پاکستان ناگزیر تھا۔ (کراچی-1982ء) ص.31

William Wedden Burn : *Allan Actavan Hume.* (London-1913) PP-59-60 - II

Seeta Ramia Pteabhi : *History of the Indian National Congress.* Vol.1 (Mudras-1935) P-8 (Vol.2 Bombay 1947) - 41

G.Chesney : *India : The Political out look, Nineteenth Century .* (London-1994) P-901 - II

William Wedden Burn : *Allan Actavan Hume.* (London-1913) PP-62-65 - III

D.Dilks : *Curzon in India.* (New Yark-1970) PP-78-79 - 42

II - رئیس احمد جعفری : سرسید سے قائداعظم تک۔ (لاہور-1970ء) ص.21

Ronaldshay (Lord Zetland) : *Life of Curzon* (London-1928) PP-79-83 - 43

II - طفیل احمد منگلوری : مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ (دہلی-1945ء) ص ص.75-270

D.Dliks : *Courzon in India.* (New Yark-1970) PP-89-99 - III

44 - مقصود ایاز۔ محمد ناصر : شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا۔ (لاہور-1987ء) ص.573

II- روزنامہ : نوائے وقت۔ لاہور۔ 10 دسمبر 1978ء (وقار انبالوی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ص.3)

45 - ایس۔ایم۔اکرام : موجِ کوثر۔ (لاہور-1984ء) ص.281

Safdar Muhmood / Javaid Zafar : *Founders of Pakistan.* (Lahore-1968) PP-134-35 - II

A.H.Albirani : *Makers of Pakistan and Modern India.* (Lahore-1950) P-152 - III

IV- ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ اکتوبر1991ء ص ص.41-43

46. محمد امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.202

47 - سید محمد ہادی : علی برادران اور انکا زمانہ۔ (دہلی-1978ء) ص ص.130-45

II - رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی ۔ (دہلی-1932ء) ص.188

III- ماہنامہ : الحق۔ اکوڑہ خٹک۔ پشاور نومبر1975ء ص ص.54-59

48 - محمد سرور : مولانا محمد علی: بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.86

49 - ایضاً . . . .

II- ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ 7جنوری1931ء ص ص.70-73

50 - ماہنامہ : نگارِ پاکستان ۔ نومبر، دسمبر1978ء ص ص.81-88

II- ماہنامہ : ماہ نو۔ کراچی۔ مارچ1968ء ص ص.70-75

51 - رئیس احمد جعفری : علی برادران۔ (دہلی-1963ء) ص.179

II - سہ ماہی : العلم۔ جوہر نمبر۔ کراچی۔ اکتوبر تا دسمبر1978ء ص ص.63-70

III - اردو انسائیکلو پیڈیا: (فیروز سنز لاہور۔ 1987ء) ص.391

II- ماہنامہ : علی گڑھ میگزین۔ جنوری1936ء ص ص.59-62

52 - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاك وہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1985ء) ص.348

II - اردو دائرہ معارف اسلامیہ : (لاہور-1986ء) ص.492

III - خورشید علی مہر : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1931ء) ص.16

Afzal Iqbal : (Ed) ***My Life : A Fragment*** (Lahore-1942) PP-32-35 - IV

M.Hasan : ***Mohammed Ali Ideology and Politics*** (Delhi-1981) P-981-85 - 53

D.Lelyveld : ***Three Aligarh Students : Aftab Ahmad Khan, Ziauddin Ahmad andMohammed Ali.*** Modern Asian Studies -1974. PP-205-18 - II

III- ماہنامہ : صدق۔ 20فروری1946ء ص ص103-07

IV- ہفت روزہ : نصرت۔ کراچی۔ آزادی نمبر۔ 14اگست1959ء ص ص.33-37

54 - فرمان فتحپوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.54

II - شریف الدین پیرزادہ : پاکستان منزل بہ منزل۔ (کراچی-1965ء) ص.96

III - چودھری خلیق الزماں : شاہراہ پاکستان۔ (کراچی-1967ء) ص.185

IV- ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ جوہر نمبر۔ مئی1977ء ص ص.15-19

Afzal Iqbal : ***Life and Times of Mohammed Ali.*** (Lahore-1979) PP- 36-37 - 55

II - ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ جوہر نمبر۔ فروری، مارچ1979ء ص ص.33-37

III- ماہنامہ : جامعہ۔ دہلی۔ 1979ء ص ص.20-23

Afzal Iqbal : *Life and Times of Mohammed Ali.* (Lahore-1979) P- 38 - 56

II - ماہنامہ : انجمن اسلامیہ۔ جوہر نمبر۔ 1974ء ص ص.69-72

57 - اشتیاق حسین قریشی : جدوجہد پاکستان۔ (مترجم: ہلال احمد زبیری) (کراچی-1990ء) ص.38

II- ماہنامہ : انجمن اسلامیہ۔ جوہر نمبر۔ فروری1966ء ص ص.80-83

58 - سید شاہ محمد قادری : مولانا محمدعلی جوہر۔ (لاہور-1998ء) ص.277

59 - ایضاً ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ، ص.276

II - روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ 12جنوری1927۔

Mohammad Ali : ***Thoughts on Present Discontent.*** (Bombay-1907) - III

S.Sardar Ali Khan : ***India of Today.*** (Bombay- 1908) PP-71-73 - IV

60 - شریف الدین پیرزادہ : بحوالہ سابقہ۔ ص.98

Surrendar Nath Banerji : ***A Nation in the Making.*** (Oxford-1925) PP-187-88 - 61

II- ماہنامہ : الحق۔ جنوری1975ء ص ص.60-62

Safeeq Allah Khan : ***Two Nation theory.*** (Hadra Abad Dakun -1973) PP-442-45 - 62

Sufia Ahmad : ***Muslim Community in Bengal 1884-1912.*** (Dacca-1974) P-239 - II

Manchester Guardian. 3 June 1907 - III

Henry Craik : ***Impressions of India.*** (London-1908) P-225 - IV

F.M. Demello : ***The Indian National Congress : A Historical Sketch.*** (London-1938) PP-41-49 - V

B.R.Ambedkar : ***Pakistan on the partition of India.*** (Bombay-1945)P-205 - 63

II- ماہنامہ : الحق۔ نومبر، دسمبر1975ء ص ص.51-52

III- ماہنامہ : انجمن۔ اکتوبر1976ء ص ص.91-94

Shereef-ud-Din Pirzada : ***Evolution of Pakistan.*** (Lahore-1963) PP-73.76 - 64

Jamil-ud-Din Ahmad : ***Historic Documents of Muslims freedom.*** (Lahore-1965) PP-5-6 - 65

P.Hardy : *Op. cit.,* PP-142-45 - II

III- ماہنامہ : قومی زبان۔ کراچی۔ اپریل1966ء ص ص.39-41

S.Razi Wasti : ***Memoirs and other writings of Syed Ameer Ali.*** (Lahore-1968) P-34 - 66

K.K.Aziz : ***Syed Ameer Ali , His life and works.*** (Lahore-1968) P-25 - II

Jamil-ud-Din Ahmed : ***Op. cit.,*** PP-7-8 - 67

68 - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1985ء) ص.322

I.H.Qurashi : ***The Muslim community of the Indo-Pakistan-Subcontinent.*** (Hage-1962) PP-32-37 - II

69 - اشتیاق حسین قریشی : جدوجہد پاکستان۔ (کراچی-1990ء) ص.42

P.Hardy : ***Op. cit.,*** PP-149-51 - II

70 - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص.51

Hery.J.Greenwel : ***His Highness : The Aga Khan, Imam of Ismailies.*** (London-1952) PP-41-59 - 71

Stanley Jackson : ***The Aga Khan : Prince, Prophet and Sportsman.*** (London-1952) P-36 - II

III - محمد علی چراغ : اکابرین تحریک پاکستان۔ (لاہور-1979ء) ص ص.504-16

IV - منشی عبدالرحمٰن : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.317-27

V - مقصود ایاز۔ محمد ناصر : بحوالہ سابقہ۔ ص.40

VI - محمد امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.169

شملہ وفد کے مطالبات:۔

1. انتخابی اداروں میں جو طریقہ انتخاب رائج کیا جائے اس میں مسلمانوں کو مخصوص حلقہ ہائے انتخاب سے خود اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق ہو۔
2. قائم مقامی میں مسلمانوں کی اہمیت اور سیاسی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔
3. مندرجہ گزٹ اور ذیلی ملازمتوں میں ایک مناسبت کے ساتھ مسلمانوں کا تقرر ہوا کرے۔ ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان جج اور ایگزیکٹو کونسل میں مسلمان ممبر مقرر کئے جائیں۔
4. یونیورسٹیوں کی سنڈیکیٹ اور سینٹ میں مسلمانوں کی تعداد مقرر ہو۔
5. محمڈن یونیورسٹی کے قیام میں امداد کی جائے۔

72 - امین زبیری : سیاست ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص.107

II - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.52-53

B.R.Ambedkar : ***Pakistan on the partition of India.*** (Bombay-1945) P-225 - III

Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) PP-62-63 - IV

India : Minto and Moraeley (Countess of Minto 1905-1910). (London-1934) PP-46-47 - V

History of Freedom Movement. Part.1. Vol.3 (Karachi-1957-1963) P-111 - 73

II - سید حسن ریاض : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.55-57

D.Lelyveld : ***Aligarh's First Generation : Muslim Solidarity in British India.*** (Princeton-1978) PP-144-51 - III

74 - سید شاہ محمد قادری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.280-81

II - روزنامہ : ہمدرد۔ دہلی۔ محمد علی جوہر۔ 12 جنوری 1927ء

III - ماہنامہ : تہذیب۔ کراچی۔ جنوری 1992ء ص ص.92-97

75 - سید شاہ محمد قادری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.285-86

II - ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ لاہور۔ اپریل 1991ء ص ص.32-41

Francis Robinson : ***Op. cit.,*** PP-365-67 - 76

P.Hardy : ***Op. cit.,*** P-156 - II

Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indian Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) PP-73-75 - III

IV - سید طفیل احمد منگلوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.349

77 - ایضاً . . . . ص ص 349-50

II - محمد علی چراغ : اکابرین تحریک پاکستان۔ (لاہور-1997ء) ص.215

S.Razi Wasti : ***Memoirs and other writings of Syed Ameer Ali.*** (Lahore-1968) P-66 - 78

D.Lelyveld : ***Aligarh's First Generation : Muslim Solidarity in British India.*** (Princeton-1978) PP-152-55 - 79

Lal Bahadur : ***The Muslim League.*** (Agra-1954) PP-35-36 - II

80 - محمد علی چراغ : اکابرین تحریک پاکستان۔ (لاہور-1997ء) ص ص.210-18

81 - سید شاہ محمد قادری : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.281-82

II - ماہنامہ : تہذیب الاخلاق۔ لاہور۔ جنوری 1990ء ص ص.102-10

82 - امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.230

83 - ایضاً ص.233

II - روزنامہ : البشیر۔ (دسمبر1934ء)

84 - محمد سرور : خطوط محمد علی۔ (دہلی-1940ء) ص ص.22-13

II - محمد سرور : مولانا محمد علی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص ص.25-23

III - ماہنامہ : ماہ نو۔ کراچی۔ تحریک پاکستان نمبر۔ ص ص.39-38

IV - ماہنامہ : بدایوں۔ کراچی۔ جولائی1995ء ص ص.20-9

85 - امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.218

II - چوہدری خلیق الزماں : بحوالہ سابقہ۔ ص ص.32-230

86 - ایضاً ، ، ، ، ، ، ، ص.234

87 - محمد سرور : مولانا محمد علی : بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ (لاہور-1962ء) ص.31

II - محمد سرور : خطوط محمد علی۔ (دہلی-1940ء) ص.18

88 - ایضاً ، ، ، ، ، ، ، ، ، ص20

89 - امین زبیری : تذکرہ محسن۔ (لاہور-1987ء) ص.220

P.Hardy : *Op. cit.,* P-72 - 90

W.W Hunter : ***Our Indian Muslims.*** (London-1971) PP120-25 - II

III - ماہنامہ : حریت۔ اسلام آباد۔ یوم آزادی نمبر۔ اگست1982ء ص ص.73-70

Seeta Ramia Pteabhi : *Op. cit.,* Vol.1 PP-35-37 - 91

C.H.Philips : ***The Evolution of India and Pakistan, 1858-1947.*** (London-1962) PP-185-87 - II

III - ماہنامہ : معارف۔ اعظم گڑھ۔ جنوری1978ء ص ص.72-71

Richard Symards : ***The Making of Pakistan.*** (London-1950) PP-39-40 - 92

F.K. Durani : ***The Making of Pakistan.*** (Lahore-1949) PP-81-87 - II

93 - طفیل احمد منگلوری : بحوالہ سابقہ۔ ص.397

II - روزنامہ : نوائے وقت۔ کراچی۔ 12جنوری1985ء (جسٹس(ر) سجاد احمد خان۔ کرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے۔ ص.7)

Mohammed Noman : ***Muslim India.*** (Allah Abad-1942) P-49 - 94

Abdul Hamid : ***Muslim Separatism in India 1858-1947.*** (Oxford-1967) PP-51-55 - 95

Sufia Ah mad : *Op. cit.,* PP-250-51 - II

Shereef-ud-Din Pirzada : ***Evolution of Pakistan.*** (Lahore-1963) PP-41-45 - 96

Khalid Bin Syeed : ***Pakistan : The Formative Phase.*** (Karachi-1960) P-174 - II

III - محمد امین زبیری : سیاستِ ملیہ۔ (آگرہ-1941ء) ص ص.89-91

I.H.Qurashi : ***The Muslim community of the Indo-Pakitan-Subcontinent.*** (Hage-1962) P-95 - 97

II - اشتیاق حسین قریشی : برعظیم پاك و ہند کی ملت اسلامیہ۔ (کراچی-1985ء) ص.105

III - ثروت صولت : ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ۔ جلد دوئم۔ (لاہور-1983ء) ص ص.81-89

William.H, Me Neilt and Marilyn Robinson Waldman (Ed) : ***The Islamic World.*** (Oxford-1977) PP-121-28 - 98

II - عطش درانی : پاکستان : ایك نظریہ ، ایك تحریك۔ (لاہور-1983ء) ص ص.35-40

S.Qalb. I. Abid : ***Muslim Struggle for Indenpence.*** (Lahore-1997) PP-23-24 - 99

I.H.Qurashi : ***A Short History of Pakistan.*** (Karachi-1984-1992) PP-30-32 - II

D.Lelyveld : ***Three Aligarh Students : Aftab Ahmad Khan, Ziauddin Ahmad and Mohammed Ali.*** Modern Asian Studies-1974. PP-156-57 - 100

Razi Wasti : ***Lord Minto and the Indinan Nationalist Movement.*** (Oxford-1964) PP-94-96 - II

A.B.Rajput : ***Muslim League Yesterday and today.*** (Lahore-1948) P-19 -101

Jamil-ud-Din Ahmed : ***Early phase of Muslim Political Movement.*** (Lahore-1965) P-83 - II

Mohammed Numan : ***Muslim India.*** (Allah Abad-1942) P-67 - III

IV - مرزا اختر حسین : تاریخ مسلم لیگ۔ (بمبئی-1940ء) ص.66

102- محمد سلیم احمد : ال انڈیا مسلم لیگ۔ (لاہور-1996ء) ص.100

103- رئیس احمد جعفری : سیرت محمد علی۔ (دہلی-1932ء) ص.224